SEPTEMBER
2023

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

جناب عباس تابش، جناب شکیل جاذب کو پرائیڈ آف پرفارمنس ملنے پر بیاض کی جانب سے
ہونے والی تقریب میں جناب باصر سلطان کاظمی (صدر) اور جناب سلیم ساگر مہمانِ خصوصی

محترمہ بلقیس ریاض، محترمہ سلمیٰ اعوان، محترمہ صوفیہ بیدار

محترمہ نیلم احمد بشیر، محترمہ شاہدہ دلاور شاہ، جناب آغا نثار، جناب ناصر بشیر، جناب حسیب پاشا، جناب شاہد ماکلی، اعجاز رضوی

محترمہ سیما پیروز، محترمہ فرحت زاہد، محترمہ رخشندہ نوید

شرکاء محفل

بانی مدیر: خالد احمد

غزل

نہ دُکھ کی موج ہی سمجھے نہ چُپ کی خُو جانے
وہ دل کو درد بتائے وہ گُل کو بُو جانے

مکان کو نہ مکیں کے شرف سے پہچانے
وہ سنگ و خشت کے ڈھیروں کو کاخ و کُو جانے

وہ میرے خُون سے کجلائے گا کئی آنکھیں
یہ رنگ وہ صفِ مژگاں کی آبرو جانے

یہ گنگ ہونٹ سلگتے ہیں کتنی روحوں میں
مرے سکوت کی چھب کیا وہ تُند رُو جانے

شگفتگی پہ ہے کب دلِ شکستہ آمادہ
وہ شامِ ہجر کو بھی صبحِ آرزو جانے

جھلستی دھوپ کہے چاند چاند اُداسی کو
ہوائے ہجر کو خالد وہ چلتی لُو جانے

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL
Freight Forwarding
Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ Karachi: (021) 34541301-7 ■ Lahore: (042) 36363300-7
■ Sialkot: (052) 3554301-6 ■ Rawalpindi/Islamabad: (051) 5162704-5
■ Faisalabad: (041) 8542924 ■ Peshawar: (091) 5606565 ■ Multan: (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا نقیب

ماہنامہ
بیاض
لاہور
ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 31- ستمبر 2023 - شمارہ نمبر: 9

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: جناب حامد یزدانی
جناب سی ایس ناہش، جناب شکیل جاذب
جناب ناصر سلطان کاظمی اور جناب سلیم ساگر

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور- 53700

فون: 3-37513000-42-92 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@tracknti e.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر و پبلشر اور پرنٹر نے زرلیک لمیٹڈ پرنٹرز 16 کلومیٹر رائے ونڈ اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	سرور حسین نقشبندی	7
2	نعت	جلیل عالی، محمد یٰسین قمر، خاور اعجاز، محمد افسر ساجد، سرور حسین نقشبندی، اسد رضا سحر	8 تا 13
3	قصیدہ نعت	خالد علیم، مرزا آصف رسول	14 تا 18
4	عقیدت	محمد افسر ساجد، اقبال سروبہ، ذکی طارق، علمدار حسین	19 تا 22
5	رباعیات	گلزار بخاری، خاور اعجاز	23 تا 24
6	گوشہ حامد یزدانی	حامد یزدانی زندگی اور تصانیف	25 تا 26
		مصنفین کی آرا: شہزاد احمد، خالد احمد، جعفر بلوچ، غلام حسین ساجد، افتخار عارف، نسیم سید، ضیاء الحسن، خولہ سہیل	27 تا 32
		افسانہ: حامد یزدانی	33 تا 35
		حامد یزدانی پر مضامین: خورشید رضوی، شاہدہ حسن، زاہد حسن، نوید صادق	36 تا 49
		غزل و نظم	50 تا 57
7	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	58 تا 66
8	طنز و مزاح / خاکے	محمد کلیم	67 تا 69

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
9	غزلیں	خالد احمد، مرتضیٰ برلاس، جلیل عالی، سید ریاض حسین زیدی ممتاز اطہر، گلزار بخاری، خاور اعجاز، نثار ترابی، مسعود احمد محمد عرفان خان، تیز سرحدی، عقیل رحمانی، اجمل اعجاز، سعداللہ شاہ رانا سعید دوشی، رخشندہ نوید، خالدہ انور، اقبال سروبہ، اعجاز روشن اویس الحسن، محمد نوید مرزا، صغیر احمد صغیر، عمران اعوان، نبیل احمد نبیل شاہد فرید، اشرف نقوی، شاہد ماکلی، مرزا سکندر بیگ عون الحسن غازی، افتخار شوکت، راحت سرحدی، اکرم ناصر اسلام عظمی، قیوم طاہر، فرحت زاہد، آشنا تھہ کنول، افشاں سجاد سعدیہ بشیر، شبہ طراز، عائشہ ظفر، عنبرین خان، نائلہ راٹھور روشی زیب، رخسانہ سمن، کوکی گل، اکمل حنیف، رانا غلام محی الدین عمر فیاض قائل، محمود کیفی، انصر رشید انصر، میثم محسن، شبیر نازش زعیم رشید، محمد نور آسی، نعیم رضا بھٹی، اکرم جاذب، محمد اشفاق بیگ ثقلین جعفری، مستحسن جامی، محمد آصف انصاری، عاصم اعجاز اصغر علی بلوچ، رضا اللہ حیدر، عاصم بخاری، مظہر حسین مظہر، سرفراز عارض بشیر احمد حبیب، آفتاب محمود شمس، شہاب اللہ شہاب، یاسر رضا آصف اظہر کمال، مجید سالک، امتیاز انجم، زبیر خیالی، سید ضیا حسین محمد اقبال رضا، شاہد شوق، ضیاالمظہری، راجہ عبدالقیوم، نعمان محمود	70 تا 145
10	مضامین	یونس خیال، خاور اعجاز، عاقر شہزاد، فرحت عباس شاہ، ناصر بشیر توقیر عباس، ثمینہ سید، ذوالفقار احسن، راحیلہ خورشید، عقیل شافی	146 تا 186
11	افسانے	سلمیٰ اعوان، بلقیس ریاض، قمر بشیر، ورداشہ ذوشین خان محمد اشرف کمال، کنیز باھو، مریم صدیقی	187 تا 216
12	نظمیں	خالد احمد، آصف ثاقب، جلیل عالی، سید ریاض حسین زیدی خاور اعجاز، سورج نرائن، علی ارمان، رخشندہ نوید، اکرم سحر فارانی اویس الحسن، احمد جلیل، شاہین عباس، فرخندہ شمیم، فرح شاہد امجد بابر، افضل ہزاروی، ثقلین جعفری، ظہور چوہان، نائلہ راٹھور خالق آرزو، فاطمہ عثمان، نوید صادق، اعجاز رضوی	217 تا 241

حمد

بندگی کا شعور دے مولا
عاجزی کا غرور دے مولا

اب اسے بے ثمر نہ رہنے دے
شاخِ مدحت کو بور دے مولا

ذہن پر ہے ہوس کی تاریکی
اس خرابے کو نور دے مولا

آخرِ شب کی اشکباری میں
کیفیت کا وفور دے مولا

یاد سرور کو اور کچھ نہ رہے
ذکر میں وہ سرور دے مولا

سرور حسین نقشبندی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچھ چھپایا نہ ہم نے دُنیا سے
عشق ہم نے کیا بھرے بازار

نعتؐ

جگ میں جس جس جگہ بپارے گئے
ساتھ سیرت کے استعارے گئے

بے ثمر جب تمام چارے گئے
اہلِ دانش تب اُسؐ کے دوارے گئے

اُسؐ کو دیکھا نہیں فقط سوچا
دل پہ نقش اُسؐ کے خود اتارے گئے

وہی انساں فلک نشیں ٹھہرے
اُسؐ کی رہ میں جو خاکسارے گئے

کوئی پہنچا نہ اُس بلندی تک
جس پہ اُس خُلق کے منارے گئے

جب بھی مل کر کیا ہے یاد اُسؐ کو
اپنے حالات سازگارے گئے

بے نوا بستیاں بہشت ہوئیں
وصف اُسؐ کے جہاں شِعارے گئے

اپنی معراجِ مرتبت ہے کہ ہم
اسؐ کے شیداؤں میں شمارے گئے

اُسؐ کے کیا کیا کرم ہوئے عالی
ہم خزاؤں میں بھی بہارے گئے

جلیل عالی

نعتؐ

اُس بارگہِ پاک کی عظمت کے تقاضے
نازک ہیں بہت آپؐ کی مدحت کے تقاضے

ہر گام رہے سامنے سرکارؐ کی سیرت
ملحوظ رہیں آپؐ کی نسبت کے تقاضے

گفتار میں کردار میں رکھ سامنے ہر دم
اُس سرورِ کونینؐ کی چاہت کے تقاضے

اے شوق! رہیں سوچ میں احکامِ شریعت
اے دل! رہیں ازبر تجھے سنت کے تقاضے

رکھ آپؐ کے اخلاق کے آفاق نظر میں
اور پیشِ نظر حسنِ ارادت کے تقاضے

جتلائے ہیں اصحاب نے کردار و عمل سے
محبوبؐ دو عالم کی محبت کے تقاضے

اس واسطے دنیا بھی زبوں حال ہوئی ہے
اُمت نے بھلائے ہیں صداقت کے تقاضے

سکھلائے ہیں قرآن نے اربابِ نظر کو
اُس غایتِ غایات کی طاعت کے تقاضے

اک نرم روی طرزِ تخاطب میں قمر ہو
ہر آن یہ کہتے ہیں ارادت کے تقاضے

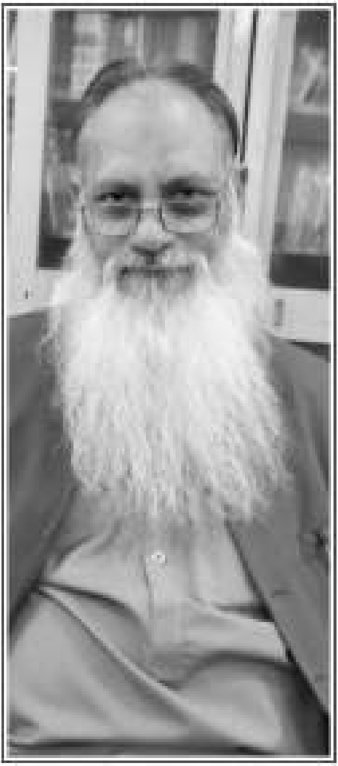

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

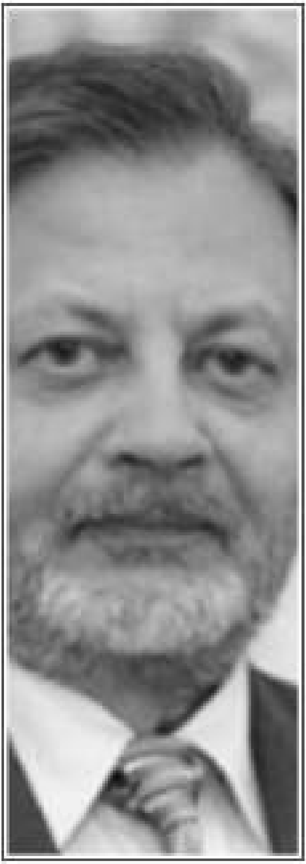

تمام نبیوں میں اعلیٰ مقام ہے انؐ کا
ہر ایک شخص پہ فرض احترام ہے انؐ کا

نہیں ہے یوں کہ کسی پر ہو اور کسی پہ نہ ہو
تمام دُنیا پہ ہی فیض عام ہے انؐ کا

گلی گلی مِرے دل کے نگر کی روشن ہے
کہ ذکرِ پاک یہاں صبح و شام ہے انؐ کا

خطاب کرتے تھے وہ رَب کے ہی اشارے پر
کلام رَب کا ہے جو بھی کلام ہے انؐ کا

فلک کے سارے اثاثوں پہ مہر ہے انؐ کی
متاعِ لوح و قلم پر بھی نام ہے انؐ کا

خاور اعجاز

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

چہرہ تمام رنگ تھا ، پیکر کرن تمام
کجلا کے رہ گئے مَہ و پروین تن تمام

نعتؐ

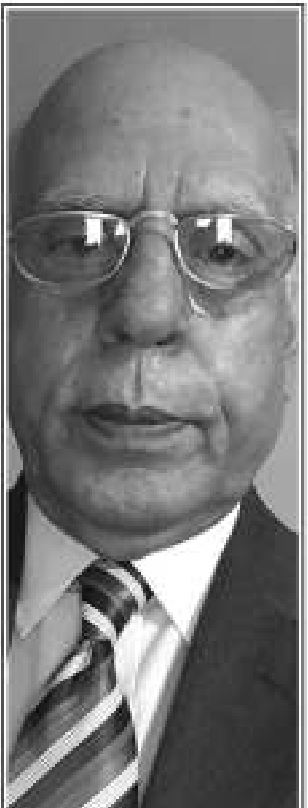

راستوں کی روشنی اور بام و در کی روشنی
سب اجالوں سے ہے افضل اس نگر کی روشنی

دیکھیے تو امتزاج اِک نور اور خوشبو کا ہے
سامنے جو ہے مدینے کے سفر کی روشنی

گھر گئے ہیں کن عجب تاریکیوں میں ہم ادھر
کیسی، دنیا سے فزوں تر ہے، اُدھر کی روشنی

دن گزرتے جا رہے ہیں زندگی کے کاش ہم
دیکھ لیں سرکارِ دو عالم کے در کی روشنی

ہیں مرے سرکار عالی منبع حُسنِ ضیاء
ہیچ اُن کے سامنے شمس و قمر کی روشنی

سید افسر ساجد

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

تو نے ہر شخص کی تقدیر میں عزت لکھی
آخری خطبے کی صورت میں وصیّت لکھی

ترکش نعت کا اردو منظوم ترجمہ

خود عشق کی سرشاری کہے جائے محمد
صد شکر مرا دل بھی ہے شیدائے محمد

امت کو ترے عشق کی سوغات ملی ہے
یہ شکر بھلا کیسے بجا لائے محمد

اس عشق کے رستے پہ مجھے چلنا سکھا دے
رہتی ہے مرے دل میں تمنائے محمد

مل جائے مجھے دونوں جہانوں میں یہ دولت
اللہ بنا دے مجھے سودائے محمد

اللہ بہم ہو مری بخشش کا بھی ساماں
ہو جائے عطا قطرۂ دریائے محمد

اے کاش کوئی شیخ بتا دے یہ وظیفہ
اے کاش میں دیکھوں رخِ زیبائے محمد

سرور کو ملے خاک ترے نقشِ قدم کی
بر آئے کسی طور تمنائے محمد

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

کچھ اس طرح سے اپنی سنواری ہے زندگی
صلِ علیٰ کا ورد ہماری ہے زندگی

آیا ہے چین مدحتِ سرکار سے مجھے
میں نے چھن چھن کے اتاری ہے زندگی

اب اذن دیجیے کہ زیارت میں کر سکوں
اب تک نجانے کیسے گذاری ہے زندگی

سلمان بن گئے ہیں وہی خوش نصیب لوگ
آ کر جنھوں نے آپؐ پہ واری ہے زندگی

منسوب ہے یہ شاہِ امم سے سو اس لیے
پروردِگار کو بھی یہ پیاری ہے زندگی

اسدرضاسحر

انتخاب

- خالداحمد -

نعمان منظور

وہ ریگِ پا نہیں تھی، ستاروں کا چھان تھا
قرآن پر گواہ تھا اُن کا چلن تمام

قصیدۂ نعت

ناقہ سواروں کو جانے کس کا گماں ہے
بے خبری میں ہجومِ بے بصراں ہے
ایک تخیّل کہ ہے جو بادیہ پیما
وسعتِ صحرا میں وقفِ ریگِ رواں ہے
کم نظری ہے جنودِ شب کی عناں گیر
پائے مسافت میں جو سراب نشاں ہے
منتظرِ رہنما ہیں قافلے والے
ایک صحیفہ کہ نذرِ گم شدگاں ہے
ملتا نہیں ہے سراغِ صد ورقِ گل
لوقا و مرقس ہیں، برنباس کہاں ہے؟
دیکھنے والوں کی آنکھ دیکھ چکی تھی
ڈھونڈنے والوں کو کوئی اور گماں ہے
کوئی ستارہ طلوعِ آخرِ شب کا
اہلِ بصیرت کو استعارۂ جاں ہے
صاحبِ نجران، ابنِ ساعدہ و زید
جن کا یقیں حق شناس و نطق فشاں ہے
چاندنی چھٹکی ہے یا کہ عرشِ عُلیٰ سے
شہپرِ جبریل کا نزول و نشاں ہے
وقت کے سرکردگاں ہیں اور ہی رَو میں
اُن کے لیے تو عیاں بھی راچہ عیاں ہے
ہفت فلک کے تمام بند ہیں اَبواب
شیطنتِ فتنہ بازگردِ فغاں ہے
ٹوٹ رہے ہیں شہاب، ڈھونڈ چکے ہیں
مرکزِ جناتِ عرض و طول کہاں ہے!

ٹوٹ گئے ہاتھ تُف بہ کبر و رعونت
بولہبی کا مزاج شعلہ فشاں ہے
سچ کے پرکھنے کو تھا شعورِ ابی جہل
دل ہی مگر بدخصالِ بدگہراں ہے
روز بھڑکتی ہے دل میں آگ حسد کی
ایک دریدہ دہن، دریدہ بیاں ہے
ندوہ کا سرخیل، وہ امیّہ بن الخلف
جب سے اسیرِ نگاہِ کم نظراں ہے
جان چکا ہے تمام شانِ نبوت
سر پہ مگر طرفِ کُلہ بارِ گراں ہے
گرچہ فلک کا چراغِ انجمنستاں
حلقۂ بازو و پائے راہرواں ہے
اُن پہ طلوعِ سحر ہو کیسے ہویدا
دل ہی اگر کم نگاہ و تیرہ مکاں ہے
مصحفِ روشن سے اُس کی آنکھ بھر آئے
اَحول و کج فکر کو نصیب کہاں ہے
رحلِ ازل سے نزول کا ہے تسلسل
حرف بہ حرفِ مُبیں کا سیلِ رواں ہے
کل تھا اگر، آج بھی ہے اصلِ حقیقت
حجتِ اتممتُ ایک سنگِ گراں ہے
تیرہ دروں کی ہے یہ تیرہ نگاہی
برگ و گل و شاخ و نخل پر جو دھواں ہے
امرءُ القیس اپنے فکر و فن کا گرفتار
صاحبِ نوحہ سرائے دوزخیاں ہے
عَمرو بن کلثوم سا امیرِ سخن بھی
غافلِ حق ہے، یکے ز بے خبراں ہے

عنتریٰ و اعشیٰ و زہیر کی دانش
دانشِ بے برگ باغ و راغِ جناں ہے
کہنہ دیاروں کے بے نصیب کھنڈر میں
طرفہ بن العبد ہے کہ نوحہ کناں ہے
ناقۂ لیلہ کی ڈھول چاٹنے والا
شاعرِ ہر تیرہ چشم، محوِ فغاں ہے
مملکتِ جنس و فحش گوئی میں آزاد
ہر عربی شعر گو کی اپنی دکاں ہے
فکر اِدھر ہے کہ مدح کی طرف آؤں
عقل مگر محوِ رنگِ جلوتیاں ہے
رکھتا ہوں جتنی بساطِ وصف بیانی
وصف، بیاں اُس کے ہوں جو وجہِ جہاں ہے
چاٹ لگی ہے غزل کی جن کے دلوں کو
طولِ بیاں اُن کو ایک محشرِ جاں ہے
قصدِ ثنا کی ہے مجھ کو آرزو ہر چند
صنفِ قصیدہ کی رُوح، سدِّ بیاں ہے
مدح کو بہرِ صفات سیدِّ عالم
مطلعِ روشن نشاطِ غم زدگاں ہے

....

نور و حضور و سرورِ قلبِ تپاں ہے
وہ مرا ممدوح، رُوحِ عالمیاں ہے
صرف مرا ہی نہیں، وہ سب کا، خدا کا
ایک حبیبِ عظیم ہفت جہاں ہے
ارضِ منوّر کا ہے جمالِ مطہّر
فرشِ حشم ہے تو گاہ عرش مکاں ہے
اُس پہ درود و سلام بھیج رہے ہیں
کتنا حسیں زمزمۂ خلوتیاں ہے
ایک یہی سازِ دل ہے، ایک یہی سوز
اک یہی شیرینیِ شیریں دہناں ہے
عائشہؓ سے پوچھ اُس کی طلعتِ رخشاں
جیسے سرِ چرخ، ماہتاب عیاں ہے
فاطمہؓ سے پوچھ اُس کے رنگ و خدوخال
جانِ پدر ہے جو اُس کی آل کی ماںؓ ہے
اماں حلیمہؓ سے پوچھ اُس کے خصائل
کمسنی میں بھی کریمِ کم نگہاں ہے
کون ہے گدڑی میں، جانتی تھی حلیمہؓ
آمنہ کا لال، لعلِ ہر دو جہاں ہے
ایک طرف وہ حسین چہرۂ تاباں
ایک طرف اک ہجومِ خاوریاں ہے
اُس کے عدو کو بھی علم ہے کہ وہی ایک
پاک دل و پاک چشم و پاک بیاں ہے
عیسیٔ مریمؑ نے دی بشارت اُسی کی
موسیٔ عمرانؑ کو شوقِ اُمتیاں ہے
بے عدد و بے شمار اُس کے زمانے
اُس کی نبوّت کراں سے تا بہ کراں ہے
سب کا رفیق و جلیس، سب کا بھی خواہ
ہم نفس و خوش نگاہِ ہم نفساں ہے
ایک حکیم و طبیب نوعِ بشر کا
چارہ گر و چارہ سازِ چارہ گراں ہے
سب کا کریم و رحیم، از رہِ تعلیم
اُمّی لقب ہے، متاعِ دیدہ وراں ہے
رمزِ طلوع و غروب کا وہ شناسا
معتبرِ حکمتِ زمان و مکاں ہے
مدح میں سب زمزماتِ طیّب اُسی کے
حُسنِ سِیَر میں مثال اُس کی کہاں ہے!

علم و حِلم کو کیا ہے مفتخر اُس نے
نکتہ وَر و نکتہ سازِ نکتہ گراں ہے
سیّدِ خیرالوریٰ، صفا کا حُدی خواں
خوش سفر وخوش عنانِ خوش سفراں ہے
اُس کے لیے رَفرَف و بُراق تھے رہوار
جس کے لیے گردِ راہ، کاہکشاں ہے
نقطۂ معراج اُس کا ہے مُتحقّق
چشم براہ اُس کا ربِّ کون و مکاں ہے
مقطعِ الہام ہے وہ صبحِ ازل سے
بابِ کرم اُس کا جبرائیل نشاں ہے
لات و ہُبل پر ہے اُس کی ضربِ مسلسل
قاطع و نساخِ اعتقادِ بُتاں ہے
لائے گا کوئی نظیر اُس کی کوئی کیا
اُس کے تفرُّد پہ، جو وحیدِ زماں ہے
بدرقۂ جاں مرا ہے فیض یاب اُس سے
راہنما، رہبرِ جنودِ دلاں ہے
رشکِ امیری ہے مجھ کو میری فقیری
مجھ کو فلک پایہ گاہ اُس کا جہاں ہے
میری دُعائیں ہوں مستجاب اُسی سے
بعدِ خدا وہ انیسِ دل زدگاں ہے
اُس کے شمائل بیان کس سے ہوئے ہیں!
کس میں یہ ہمت ہے، کس کو تاب وتواں ہے
ایک سخن وَر ہی کیا کہ سارے سخن وَر
لکھ سکیں وصف اُس کے، یہ مجال کہاں ہے!
اور کہاں مجھ سے کم سواد سے ممکن
اُس کی عطا ہے جو میری طبع، رواں ہے
میرے دل و دیدہ میں ہے اُس کا تصور
نعت میں جو نغمہ بارِ حرف و زباں ہے
ایک یہی آرزو ہے، لکھ کے رکھوں میں
گھر میں کسی صفحے پر، جو دل میں نہاں ہے
جلتا رہوں جس میں، اُسؐ کے ہجر کی ہو آگ
بادِ سمومِ ستم کہ برق تپاں ہے
دیدہ و دل میں ہو نم فراقِ نبیؐ کا
روشنیِ عہدِ نو کہ درپئے جاں ہے
راکھ میں کوئی شرر نہیں تو کہوں کیا؟
کشتۂ غم کا نصیب صرف دُھواں ہے
کٹنے لگی ہے زبانِ صدق و صفا کی
دار و رَسَن ہی سزائے خود نگراں ہے
میں ہی نہیں، جانتا ہے میرا خدا بھی
عصرِ رواں کتنا عہدِ امن و اماں ہے؟
حوصلۂ ہر غنیم ہے مُتحرّک
ہر کلمہ گو پہ تیز تیرِ کماں ہے
اُس کے کرم کا امیدوار ہے خالد
زندگیِ بے چراغ، وقفِ فغاں ہے
اُڑتا چلا جا رہا ہے اَبلقِ ایّام
کیا خبر، کتنی قریب رحلتِ جاں ہے؟
اِس کی شفاعت بھی ہو کہ بے عملی میں
اُمّتیِ بے بصر کو فکرِ زیاں ہے

خالد علیم

ختم الرسل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

احمد ہیں مصطفیٰ ہیں ختم الرسل محمدؐ
اور فخرِ انبیا ہیں ختم الرسل محمدؐ

جن و بشر، ملک سب رب کی رضا کے طالب
اور رب کی خود رضا ہیں ختم الرسل محمدؐ

جس سے حمیدِ یکتا محمود ہر کسی کا
وہ حمید وہ ثناء ہیں ختم الرسل محمدؐ

وہ شمعِ بزمِ ہستی، ہر سمت ضوانہی کی
محبوبِ کبریا ہیں ختم الرسل محمدؐ

دنیا ہو لاکھ حاسد عقبیٰ مگر ہے شاہد
حماد ذوالِلواءَ ہیں ختم الرسل محمدؐ

امکاں کی ہر بلندی ہے گردِ راہ جس کی
وہ بالِغُ العُلیٰ ہیں ختم الرسل محمدؐ

تقدیرِ کُن نے دیکھا اُن میں جمال اپنا
آئینۂ قضا ہیں ختم الرسل محمدؐ

جس نے کیا تمدُّن کو ہر افق سے روشن
وہ کاشِفُ الدُّجیٰ ہیں ختم الرسل محمدؐ

تھی کیا وہ صبحِ نعمت نازاں ہیں حسنِ جنت(۱)
مولود آمنہؓ ہیں ختم الرسل محمدؐ

اخلاص و عفو و عصمت اصلاح سے عبارت
ہستی کا تکملا ہیں ختم الرسل محمدؐ

آغاز ہے انہی سے، انجام بھی انہی پر
مبدأ ہیں منتہیٰ ہیں ختم الرسل محمدؐ

ایثار و صبر و تقویٰ کو رتبہ جس نے بخشا
وہ محسنِ صفا ہیں ختم الرسل محمدؐ

ہے لا نبیَّ بعدی میں گُم ہر اک رسالت
اب مظہرِ بقا ہیں ختم الرسل محمدؐ

دھڑکے ہے جس کی الفت میں ہر دلِ اطاعت
وہ جانِ اقتدا ہیں ختم الرسل محمدؐ

(۱) ۵۷۱ء

خلق و نسم بھی اُن کے لوح و قلم بھی اُن کے
مولائے دو سرا ہیں ختم الرسل محمدؐ

جس کے کرم پہ نازاں ایثار و عدل و احساں
وہ مصدرِ عطا ہیں ختم الرسل محمدؐ

جیون کی ناؤ کو کیا؟ اب ڈر کسی بھنور کا
تا خُلد ناخدا ہیں ختم الرسل محمدؐ

پیغامبر تھے جتنے، سب مدعی تھے حق کے
خود حق کے مدعی ہیں ختم الرسل محمدؐ

لَاتَــرْفَعُوا جو سمجھو قرآں کی آیتیں بھی
سب اُن کی ہی صدا ہیں ختم الرسل محمدؐ

ہے عفت و تقدس کی ہر نفس گواہی
تکمیلِ تزکیہ ہیں ختم الرسل محمدؐ

پھر غیر کی غلامی کیوں؟ جب ہو یہ عقیدہ
ہادی ہیں رہنما ہیں ختم الرسل محمدؐ

ہے لَااِلٰـــہَ اِلَّا میں جس سے روشنی وہ
الـــلّٰــہ کی ضیا ہیں ختم الرسل محمدؐ

جس شانِ عَبْـــدُہٗ کو ہم نور کہہ سکے بس
اس سے کہیں سوا ہیں ختم الرسل محمدؐ

آصف! وہ کُنْتُ کَنْزاً اس پہ ہے آپ شاہد
دانائے ہر خفا ہیں ختم الرسل محمدؐ

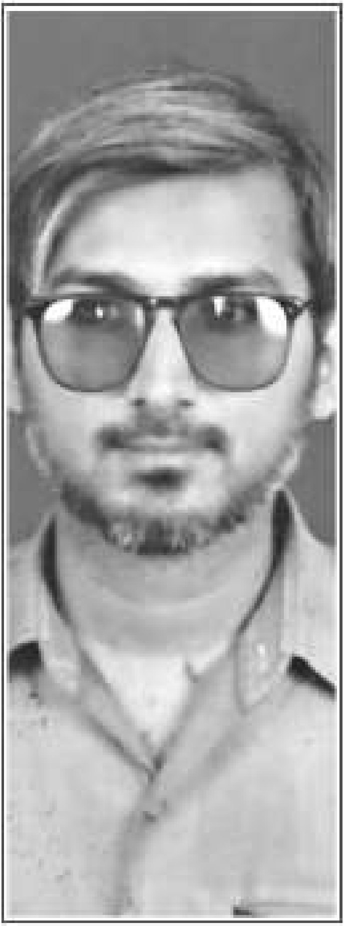

مرزا آصف رسول

عقیدت

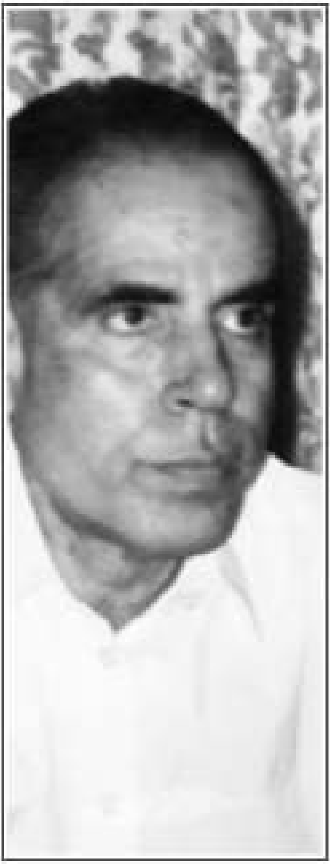

سید افسر ساجد

حسینؓ آپ نے جاں دی
زمیں لہو کر دی
کہ قدر کوئی تو زندہ رہے زمانے میں
حسینؓ آپ اصولوں پہ ہو گئے قرباں
عدو کو مات ہوئی ____

حسینؓ آپ کی عظمت کو ہم سلام کریں
کہ کربلا ہے علامت
عروجِ آدم کی
زوال اُس کو ہُوا
جس نے جبر و دہشت سے
صداقتوں کے تقدس کو پائمال کیا

توصیف کرے اصغرؓ و اکبرؓ کی وہ کیسے؟
زینب کے لیے ایک حسینؓ ، ایک حسنؓ ہے

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

عقیدت

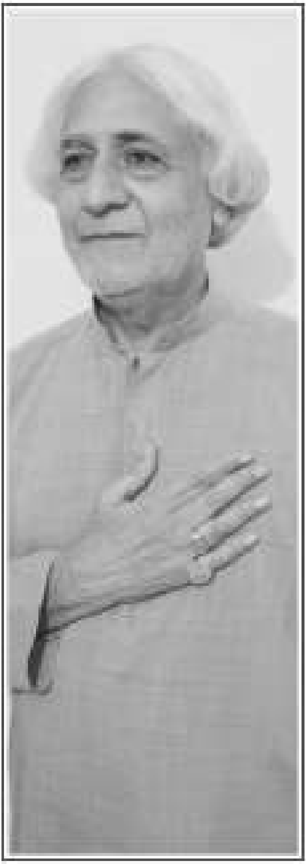

یہاں وہاں کی ہر اک زندگی سے آگے ہے
یہ وہ سفر ہے کہ جو، روشنی سے آگے ہے

ازل سے لے کے، ابد تک شہادتیں ہوں گی
مرا حسین مگر، ہر کسی سے آگے ہے

ہر ایک لفظ بناتا ہوں، اسلئے میں چراغ
ترا خیال، مری شاعری سے آگے ہے

حسینیت کی وساطت سے معتبر ہوں میں
سُو لمحہ مرا، ہر صدی سے آگے ہے

حسین لفظ نہیں، کائنات ہے اقبال
اِسی لئے تو خودی، بے خودی سے آگے ہے

اقبال سروبہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ابرو ہیں کہ قوسین پہ قوسین دھرے ہیں
پلکیں ہیں کہ آنکھوں پہ حیا ابر فگن ہے

عقیدت

آیئے پڑھ لیں درودِ پاک برکت کے لیے
اپنے ایمان و یقین کی زیب و زینت کے لیے

جب مرے سرکار ہیں میری شفاعت کے لیے
پھر مجھے فکر و تردد کیوں ہو جنت کے لیے

ان صحابہ کی عقیدت کو میں کرتا ہوں سلام
جاں لٹا دیتے تھے جو اک ایک سنت کے لیے

جب کیا بوجہل نے ذاتِ نبوت پر سوال
سنگریزے بول اٹھے پاسِ رسالت کے لیے

بخش دیں میرے نبی نے بیٹیوں کو عظمتیں
منتخب زہرہ کو کر کے دیں کی وسعت کے لیے

آیئے دل سے کہیں ہم یا نبی صلی علیٰ
اپنے اس بے چین و مضطر دل کی راحت کے لیے

زلف ہے واللیل تو والشمس ہے روئے مبیں
یعنی جسمِ مصطفےٰ بھی ہے تلاوت کے لیے

دوستو گاؤ گے کب تک زلف اور چہرے کے گیت
وقف کر دو زندگی آقا کی مدحت کے لیے

اس غریبی میں ہی ان شاء اللہ طیبہ جاؤں گا
غیر ممکن کچھ نہیں ہے اس کی قدرت کے لیے

سوچتا ہوں میں بھی کافر ہوتا یا مشرک "ذکی"
جو مرے سرکار نہ آتے ہدایت کے لیے

ذکی طارق

عقیدت

"حر" بناتا ہے یا "خدائے حسین"
یا جسے راستہ دکھائے حسین

سن رہا ہوں صدائے "ہل من" کو
کربلا سے مجھے بلائے حسین

کربلا ہے حسین کی جنت
جس کو چاہے یہاں بسائے حسین

خاک میں آ گیا شفا کا اثر
جب ملی اس میں خاک پائے حسین

ظالموں کی جگہ نہیں اس میں
دل مرا ہے فقط برائے حسین

وہ کسی اور کا ہوا ہی نہیں
بھا گئی ہے جسے ادائے حسین

ان میں رائج ہے طرزِ حق گوئی
کر رہے ہیں جو اقتدائے حسین

بچ گیا وہ غمِ زمانہ سے
ہو گیا جس کا دل فدائے حسین

میرے مولا نہ دے مجھے شاہی
بس بنا دے مجھے گدائے حسین

میں طلب گار کب بہشت کا ہوں
میری جنت ہے کربلائے حسین

ذکرِ تشنہ لبی کوئی چھیڑے
آنکھ بن جائے آبنائے حسین

تجھ پہ قربان تخت و تاج کئی
چاک دامانیٔ قبائے حسین

دل کا گریہ ہے دیدنی اب بھی
اور اگر کربلا سنائے حسین

ڈر ہے اب تک یزید کے دل میں
پھر کہیں سے نہ لوٹ آئے حسین

تیرے کردار ہیں امر مولا
تجھ سا کوئی نہیں خدائے حسین

علمدار حسین

رباعیات

تندی سے مظالم کی فضا کٹ جائے
تارِ قاتل سے ابتلا کٹ جائے
آتی ہے صدا خون میں تر بچوں کی
اے کاش حکومت کا گلا کٹ جائے

....

انصاف سے غافل کو نہ عادل سمجھو
بلکہ اسے ظالموں میں شامل سمجھو
بنیادِ ستم فیصلے جس کے ٹھہریں
منصف ہی نہ کیوں ہو اُسے قاتل سمجھو

....

بازی کسی رُت میں نہ پلٹتے دیکھی
مشکل نہ ستم زدوں کی گھٹتے دیکھی
پھرتی رہی مخلوق کی گردن پہ ہی ڈور
گردن کسی قاتل کی نہ کٹتے دیکھی

....

رکھتے ہی نہیں یاد پذیرائی کو
بھولے ہوئے ہیں آپ مسیحائی کو
حکام ہیں خود جھوٹ میں شامل ورنہ
دشوار نہیں روکنا مہنگائی کو

....

دل جب کوئی شاہی سے لگا بیٹھتا ہے
جیون اسی خواہش میں گنوا بیٹھتا ہے
سب تاج کے طالب ہیں مگر علم نہیں
کس سر پہ حکومت کا ہما بیٹھتا ہے

....

کب کونسا ہنگامہ بپا ہونا ہے
ملنا ہے کسی سے کہ جدا ہونا ہے
پھر کیوں ہو پریشاں کوئی اس بارے میں
جب علم کسی کو نہیں کیا ہونا ہے

....

لائے نہ ثمر مغز کھپانا کچھ بھی
کہتے رہیں سب عاقل و دانا کچھ بھی
ذخار ہے بھیدوں کا سمندر اتنا
جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی

....

جیون کے لیے یہی غم خواب حیات
قائم اسی باعث ہے تب و تابِ حیات
کیا خضر و سکندر کو یہ معلوم نہ تھا
پانی کے سوا اور نہیں آبِ حیات

....

ہے خیر محبت کی علامت ہونا
بندے کا مناسب قد و قامت ہونا
ہے وصفِ نبیؐ ربِ جہاں کے نزدیک
اسلام کا مطلب ہے سلامت ہونا

....

گلزار بخاری

رباعیات

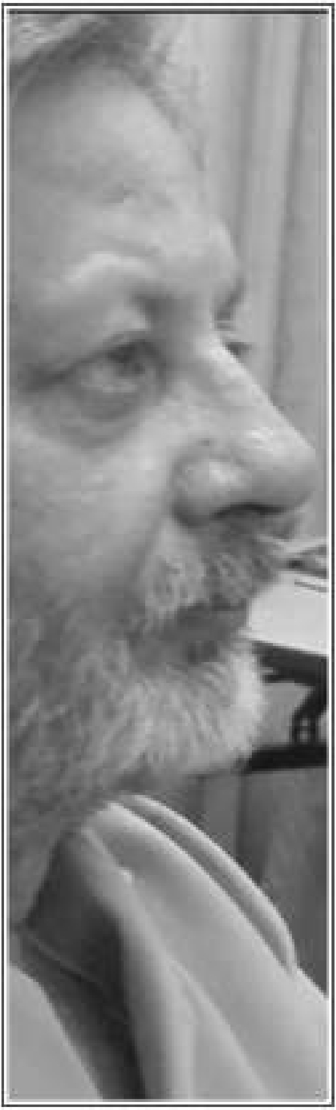

یہ زیست ہے اِک لمحۂ فانی یارب
پھر یاد کسے میری کہانی یارب
ہو جائے کسی روز ازل سے بے باق
کب تک یہ حساب اور زبانی یارب

یہ شوق کئی صدیوں پرانا ہے ہمیں
کاشانہ وہی پھر سے بسانا ہے ہمیں
یارب ! یہ گذارش ہے اگر تُو مانے
آئے ہیں جہاں سے وہیں جانا ہے ہمیں

چُھوتا اُسے اور رنگِ قبا ہو جاتا
اِک قرض محبت کا ادا ہو جاتا
وہ خوشبوِ نادیدہ اگر مِل جاتی
مَیں شوق کے قلزم میں فنا ہو جاتا

اوروں پہ مسلسل ہی کرم ہے اے دوست
دِل میں ترے انصاف کا غم ہے اے دوست
بخشی ہے ہمیں قرب کی دولت لیکن
اِک رات کی بخشش بڑی کم ہے اے دوست

خاور اعجاز

حامد یزدانی: زندگی اور تصانیف

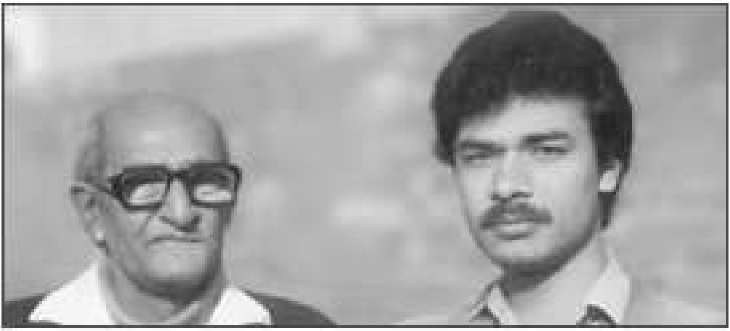

جناب حامد یزدانی اپنے والد صاحب جناب یزدانی جالندھری کے ساتھ۔

مکمل نام: سیّد حامد یزدانی

ولدیت: سیّد عبدالرشید یزدانی جالندھری اور سیّدہ رشیدہ جہاں گیلانی

سنِ ولادت: 1961 بمقام: لائل پور (فیصل آباد)، پاکستان

پرورش: لاہور، پاکستان

مستقل سکونت: ٹورانٹو، کینیڈا

تصانیف (مطبوعہ): ابھی اک خواب رہتا ہے (اردو شاعری) طبعِ اوّل 1992 طبعِ دوم 2007

رات دی نیلی چپ (پنجابی شاعری) طبعِ اوّل 2002

گہری شام کی بیلیں (اردو شاعری) طبعِ اوّل 2007

اطاعت (اردو نعتیں) طبعِ اوّل 2010

خالی بالٹی اور دوسرے افسانے۔ طبعِ اوّل 2022

ہم ابھی رستے میں ہیں (اردو نظمیں اور غزلیں) 2023

عہد میرا مجھے پہچان نہ پایا عارف (مرتبہ: خالد سہیل، حامد یزدانی) 2023

2023... From One Loneliness to Another

(English Traslation of urdu poems by M. Salim ur Rahman)

تصانیف (زیرِ ترتیب): کلیاتِ یزدانی جالندھری

کسی اور ساحل سے (بین الاقوامی نظموں کے تراجم)

باتیں اُن کی (ادبی انٹرویوز) — طبع زاد انگریزی نظمیں

طبع زاد انگریزی افسانے — شعری مجموعے۔ ہائیکو، رباعیات

مجھے یاد ہے (سوانح) — تازہ طبع زاد افسانے

جدید مغربی افسانے (اردو تراجم) — ادبی مضامین، کالم

ادبی جرائد (جن میں تخلیقات شائع ہوئیں):

فنون، اوراق، ماہ نو، ادبیات، افکار، بیاض، بیسویں صدی، نئی قدریں، محفل، شام وسحر، راوی، قرطاس، نیرنگِ خیال، ادب لطیف، کتاب ڈائجسٹ، آثار، ریختہ (ویب سائٹ)

تعلیم:

ماسٹر آف سوشل ورک۔ ولفرڈ لاریئے یونی ورسٹی، واٹرلو، کینیڈا

ایم۔اے سوشیالوجی۔ پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، پاکستان

آنرز ڈپلوما ان سوشل سروسز ورکر۔ موہاک کالج ہملٹن، کینیڈا

بی۔اے۔ گورنمنٹ کالج لاہور، پاکستان

جرمن زبان سرٹیفکیٹ۔ یونی ورسٹی آف کولون، جرمنی، گوئٹے انسٹی ٹیوٹ، لاہور

پیشہ ورانہ ادارے:

(سیٹلمنٹ سپیشلسٹ) امیگرنٹس سروسز، وائے ایم سی اے، ہملٹن، کینیڈا

(کمیونٹی ڈویلپر) سوشل پلاننگ اینڈ ریسرچ کونسل، ہملٹن، کینیڈا

(فیملی سروس آفیسر) فیملی اینڈ چلڈرنز سروسز آف گوایلف، کینیڈا

(پروڈیوسر، ایڈیٹر) ریڈیو ڈوئچے ویلے۔ دی وائس آف جرمنی، کولون، جرمنی

(کمپیئر، سکرپٹ رائٹر) ریڈیو پاکستان، لاہور

(لیکچرار) گورنمنٹ ڈگری کالج شیخوپورہ، پاکستان

(کمپیئر، سکرپٹ رائٹر) ریڈیو پاکستان لاہور، پاکستان

(میگزین ایڈیٹر) فانوس، سورج، بازگشت لاہور، پاکستان

(جزوقتی وابستگی) روزنامہ 'جنگ'، لاہور، روزنامہ 'امروز'، لاہور، روزنامہ 'وفاق'، لاہور

(مستقل کالم نگار) ویب سائٹ: 'ہم سب' اور ویب سائٹ: 'مکالمہ'

ادبی سرگرمیاں: سابق سیکرٹری۔ حلقہ اربابِ ذوق، ٹورنٹو، کینیڈا،

سابق سیکرٹری۔ حلقہ اربابِ ذوق، جرمنی

سابق جائنٹ سیکرٹری۔ حلقہ اربابِ ذوق، لاہور، پاکستان

سیر و سیاحت:

کینیڈا، امریکہ، جرمنی، برطانیہ، ہالینڈ، بلجیم، لکسمبرگ، متحدہ عرب امارات، سعودی عرب، پاکستان

رابطہ کے لیے: urdupoet@gmail.com hamidyazdani@hotmail.com

http://www.facebook.com/hamid.yazdanii

اہلِ فن کی آرا

غزل کی دیوی حامد یزدانی پر مہربان ہے

.........شہزاد احمد

غزل ایسی صنفِ سخن نہیں ہے جس پہ دسترس حاصل کرنا آسان کام ہو، اس کا ایک تہ دار فکری نظام ہے جس کے حوالے کے بغیر غزل کے مطالبے پورے نہیں ہوتے۔ بہت سے غزل کہنے والے مدتوں کے بعد بھی اس فن کو نہیں سیکھ پاتے مگر کبھی کبھی کوئی نوجوان ایسا بھی نظر آجاتا ہے کہ لگتا ہے کہ غزل کی دیوی اس پر مہربان ہوگئی۔

حامد یزدانی انھی چند لوگوں میں سے ایک ہے جو غزل کی روایت کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں اور اپنا شعر کہنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ اس کے ہاں بہت سے شعر ایسے ہیں جو تازہ بھی ہیں اور غیر مانوس بھی نہیں لگتے۔ جیسے یہ اشعار:

وہی کھنک ہے ایک کھرے سِکے جیسی
میں نے اُس کے لہجے سے پہچانا ہے

میں دشمنوں سے نہ ملتا تو جان سے جاتا
مِرے خلاف صف آرا تھی دوستی میری

اُسے بھی خواب میں آنے کا وقت بھول گیا
مجھے بھی یاد نہیں آنکھ کب لگی میری

نئے تخلیقی توازن پر مبنی شاعری

.........خالد احمد

حامد یزدانی، نظم اور غزل میں یکساں موثر شعری کارکردگی کا اظہار کرکے نوجوان شعرا میں اپنے لیے ایک منفرد مقام متعین کرچکے ہیں۔ وہ جدید تر پاکستانی شاعری کے مرکزی موجہٗ رواں کا حصہ ہیں---وہ ادبی پیش منظر میں کچھ نئے رنگوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ یہ رنگ کیسے سج رہے ہیں؟ کیسے لگ رہے ہیں؟ یا یہ کہ ان رنگوں کی چمک نگاہوں کو کب تک خیری رکھے گی؟ اس سوال کا جواب اہلِ فن کی تیز گامی اور اہلِ زمانہ کی سُست روی کے درمیان ایک نئے توازن کے قیام پر مبنی ہوتا ہے۔

حامد یزدانی نے اِس توازن کو پالیا ہے۔ یہ کرشمہ انھوں نے کردکھایا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے حبیبؐ کے صدقے حامد یزدانی کی کوشش کو بارآور رکھے۔ آمین

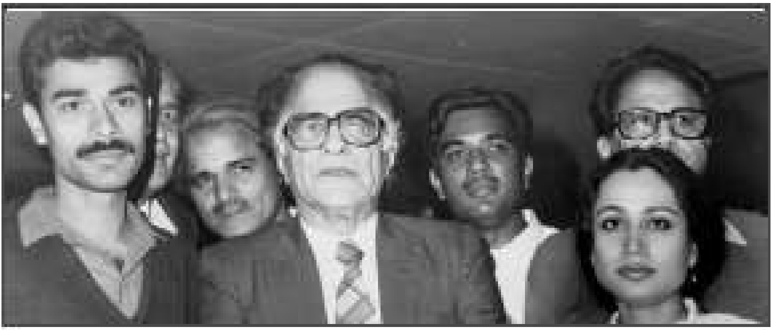

محترمہ پروین شاکر، جناب احمد ندیم قاسمی اور جناب حامد یزدانی۔

حامد یزدانی کی نعت نگاری

جعفر بلوچ

سید حامد یزدانی میرے پیر زادے ہیں۔ حضرت سید یزدانی جالندھری کو پیر جی کا لقب حضرت طفیل ہوشیار پوری نے دیا تھا اور ان کے تتبع میں یزدانی صاحب کے متعدد دیگر معاصر بھی عموماً انہیں پیر جی ہی کے لقب سے یاد کرتے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی نسبی سیادت کے علاوہ اپنے علم و فضل اور انشا و ادب میں اپنے بلند مقامات کے حوالے سے بھی یزدانی صاحب پیر جی ہی تھے۔

اپنے گھر کے غیر معمولی علمی اور ادبی ماحول کی بدولت پیر جی کے سب بچے ذوقِ سخن کی دولت سے مالا مال اور تخلیق و تصنیف کے ورثے سے بہرہ ور ہیں۔ سید حامد یزدانی کو پیر جی کے ورثۂ علم و ادب سے ضیغمانہ حصہ (Lion's share) ملا ہے۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں اپنے زمانہ طالب علمی میں بھی وہ اپنے ہم عمر اہلِ قلم میں بہت ممتاز تھے۔ مزید خوش آئند بات یہ ہے کہ ان کا علمی و ادبی ذوق ہنگامی اور عارضی ثابت نہیں ہوا بلکہ یہ ان کا مستقل رفیقِ حیات بن چکا ہے۔

حمد و نعت کا شعبہ دیگر اصنافِ سخن کی بہ نسبت زیادہ فنی کمال و رسوخ کا متقاضی ہے۔ یہ مقامِ مسرت ہے کہ سید حامد یزدانی ان مقدس موضوعات پر اپنی تخلیقی کاوشیں پیش کرنے سے پہلے مطلوبہ فکری اور فنی اوصاف سے اطمینان بخش حد تک متصف ہو چکے ہیں۔ ان کے پیرایہ ہائے اظہار تربیت یافتہ محکم اور مصقل شدہ دکھائی دیتے ہیں۔ قرطاس و قلم سے سروکار رکھنے والے اپنے معاصر دستے میں وہ نہایت اعتماد اور وقار کے ساتھ کامیابیوں کی طرف فاتحانہ بڑھ رہے ہیں۔ سید حامد یزدانی کے زیرِ نظر حمدیہ اور نعتیہ کلام میں فکر و نظر کی آب و تاب قاری کے ذہنی اور وجدانی آفاق کو روشن تر کرتی ہے۔ حمد

ونعت میں بیان ہونے والے مضامین و خیالات ہمارے دور میں بھی بیشتر وہی ہیں جو صدیوں سے ان اصناف ادب کا سرمایہ رہے ہیں۔ تاہم شعرائے کرام اپنے معاصر ماحول و مسائل کے ذکر سے اور ذاتی احساس و تاثر کے اظہار سے اس باب میں جدت اور تازگی کا رنگ پیش کرنے کی سعی بلیغ کرتے رہے ہیں۔ سید حامد یزدانی نے بھی انہی حوالوں سے اپنے مجموعہ حمد و نعت کو منفرد اور متنوع بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ گوناگوں فنی محاسن بھی اس مجموعہ کلام میں جابجا فروزاں نظر آئیں گے۔

شعر کی موجود روایت کو کئی قدم آگے بڑھاتی شاعری

.........غلام حسین ساجد.........

دن کتنے رنگوں سے بھرا ہوتا ہے۔ یہ شہر کے مکین تب جانتے ہیں جب وہ شہر سے باہر کھلے میدانوں اور سنگلاخ پہاڑوں کے سفر پر نکلتے ہیں۔ حامد یزدانی کا یہ مجموعہ اِسی سفر کی داستان ہے مگر اس سفر میں مادر وطن سے ہجرت کے احساس نے کئی ایسی کیفیات کو جنم دیا ہے جس کا تجربہ کسی سیاح کو نہیں ہو سکتا۔ یہ کیفیات یاد اور موجود کے تفاوت سے پیدا ہونے والے حزن کی نشاندہی کرتی ہیں اور ایک حساس شاعر کے باطن کی خبر دیتی ہیں۔ حامد یزدانی کی نظموں اور غزلوں میں یہ نعمت اپنی پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے۔

اس کتاب کی نظموں میں موضوعات کے حوالے سے بڑی وسعت ہے۔ یہ نیویارک، جسے گورکی نے "City of yellowo devil" کی عرفیت سے یاد کیا تھا، کی شہرۂ عالم عمارتوں اور علاقوں میں پنپتی زندگی کی حقیقت پسندانہ نقش گری کرتے ہوئے اُس مغائرت کی خبر دیتی ہیں جو انسان کے اپنے سیارہ سے غیر متعلق ہونے کی وجہ بن رہی ہے اور سرمایہ داری نظام کی دین ہے۔ شاعر اس تناظر میں آرٹی فیشل انٹیلی جینس کی طرف بڑھتی زندگی کے تناظر میں اپنا مقام متعین کرتے ہوئے اپنی تہذیبی روایت کی بازیافت کے ذریعے سے اپنے موجود سے نسبت پیدا کرتا اور اس میں خیر کی کونپل کی پرورش کرتا محسوس ہوتا ہے، جسے سرسبز رکھنے کے لیے وہ اپنی جڑوں کی طرف مراجعت کرتا ہے۔ زر کے نشے سے بے قابو ہوتی اس دنیا میں اپنے اصل سے نسبت، خواہ وہ احباب کو یاد کرنے کے بہانے سے ہو یا شہر اور اُس کے خوابیدہ گلی کوچوں کی نقش گری کے حوالے سے، ہیئتی کا رنگ لیے ہے اور اس کتاب کے خلق ہونے کی اساس ہے۔

یہ مجموعہ فاصلاتی دوری کو مٹاتی ہوئی کتاب

ہے، خواہ یہ دوری دو تہذیبوں کے مابین ہو یا دو دنیاؤں کے۔ اس میں فردا کی طرف بڑھتے ہوئے قدم اور ماضی کی طرف لپکتی ہوئی نگاہ ہے اور ان دونوں کو ایک کرتی ہوئی تخلیقی بصیرت۔ اس پر یہ نظمیں بے کنار جدت کا استعارہ ہیں اور کئی طرح کے انسانی اعمال اور ردعمل کا خزانہ ہیں۔

حامد یزدانی کی غزلیں بے ساختہ اور جدت طرازی کا مرقع ہیں۔ ان میں دل کو موہ لینے والی عجیب سرشاری ہے اور اشعار میں یادداشت سے چپک جانے کی قوت۔ زبان، آہنگ اور اُسلوب کے حوالے سے جدید تر ہونے کی کوشش کے باوصف شاعر کی فکری اُٹھان نے ان غزلوں کو، روایت سے وابستہ ہونے کے باوجود، روایتی ہونے سے محفوظ رکھا ہے اور ندرتِ فکر کی سطح پر بے کنار تازگی سے مملو کیا ہے۔ اس قدر کہ خیال خوشبو اور لفظ لو دیتے محسوس ہوتے ہیں اور غزل کی موجود روایت کئی قدم آگے بڑھتی محسوس ہوتی ہے۔

یہ شاعری جن بھری یا خفی احساسات کو منقش کرتی ہے وہ انوکھے بھی ہیں اور ان چھوئے بھی۔ اس لیے کتاب "ہم ابھی رستے میں ہیں" کو میں ایک بخت آور تحت سمجھتا ہوں اور اس کی اشاعت کو ایک ادبی واقعہ۔

دُور سے آتی دل نشیں آواز

افتخار عارف............

آوازوں کے ہجوم میں کہیں بہت دُور سے آتی ہوئی کوئی دل نشیں آواز اپنی طرف متوجہ کرے تو ایک خوشگوار سی حیرت ہوتی ہے۔ حیرت یوں کہ یہ واقعہ کم کم ہوتا ہے اور خوشگوار یوں کہ ایک نئی آواز کا اپنی شناخت کے تعارفی مرحلے میں اپنی طرف متوجہ کر لینے کا عمل روز روز نہیں ہوتا۔

وطن سے دُور اجنبی دیاروں میں اپنے منظروں اور اپنے چہروں، اپنی یادوں اور اپنے خوابوں سے اُلجھتی ہوئی زندگی کو شاعری میں منتقل کرنے والوں میں حامد یزدانی کا نام ایک اچھا اضافہ ہے۔ آغازِ سفر کا دلآویز منظر فردا کے روشن امکان کی آئینہ داری کرتا ہے۔

پیلے پتوں پر پرندے نظم کرنے والا شاعر

نسیم سیّد............

پت جھڑ کی یہ پہلی بارش
آج پرندے نظم کرے گی
دن بھر پیلے پتوں پر

میں نے حامد یزدانی کی یہ نظم نہ جانے کب اور کہاں پڑھی تھی!۔۔۔ اس بہت چھوٹی سی نظم نے

بہت دیا ہے ساتھ رکھا اور جیسے ہی آج کچھ لکھنے بیٹھی تو اس کے بے شمار خوبصورت اشعار ذہن میں موجود ہونے کے باوجود پھر اس نظم نے میرا قلم تھام لیا۔۔۔ پتے ٹوٹ ٹوٹ کے گر رہے ہیں اور اس کے ساتھ پرندوں کا بسیرا بھی کسی گھر کی کچی دیواروں کی طرح اپنی بنیاد پر گر رہا ہے۔ حالات کے بے رحمی اور بے گھری کا دکھ نہ جانے کتنے ہجرت نصیبوں نے رقم کیا ہو گا لیکن یہ حامد یزدانی ہے جو زبان و بیان پر حاکمانہ قدرت رکھتا ہے۔ جس کی تراکیب کی درستی اور بندش کی چستی یوں ہے جیسے آگ میں گرمی و روشنی۔ ہر نظم ہر غزل ہر شعر تاثیر میں ڈوبا ہوا اور جس کے کلام کے سادہ پن پر ہزار بانکپن قربان ہے۔

فرمان صاحب کہتے تھے: ”شاعری شخصیت کا منہ بولتا روپ ہے۔ شخصیت جتنی شائستہ، نفیس و سنجیدہ ہو گی اس کا بولتا روپ اتنا ہی لطیف و حسین اور سنجیدہ و نفیس ہو گا۔“

حامد یزدانی کی شاعری اسی شائستگی، نفاست، خوبصورتی اور سنجیدگی سے آراستہ ہے۔ اس کی شاعری اس کی شخصیت کے حسن کا جیتا جاگتا البم ہے گویا۔ اس کی شاعری میں موجود فکر کی تہہ داری، لہجے کی شائستگی اور بیان کا اچھوتا پن اُس تخلیقی توانائی کا پتہ دیتے ہیں جو کسی شاعر کو جہد اظہار میں اپنا مقام ہاتھ آجانے کے بعد نصیب ہوتی ہے۔ حامد یزدانی کا تازہ مجموعہ ”ہم ابھی رستے میں ہیں“ سند ہے اس بیان پر۔

منفرد تخلیقی رچاؤ سے مزین شاعری

............ضیاالحسن............

حامد یزدانی کا شمار اسّی کی دہائی میں نمایاں ہونے والے شاعروں میں ہوتا ہے۔ انھیں کلاسیکی شاعری کا رکھ رکھاؤ [یزدانی جالندھری صاحب سے] ورثے میں ملا اور جدیدیت کے عناصر اپنے عہد سے۔ اُن میں کہیں کہیں اُن کے مزاج کی رومانویت بھی شامل ہو گئی ہے۔ ان تینوں سے مل کر تشکیل پانے والا اُن کا شعری اسلوب اپنے عہد سے ہم آہنگ بھی ہے اور منفرد بھی۔ کلاسیکی روایت سے انھوں نے مصرع سازی کا ہنر سیکھا ہے۔ ان کے مصرعے جدت کے باوجود تخلیقی رچاؤ سے مالا مال ہوتے ہیں جس سے وہ لطفِ سخن پیدا ہوتا ہے جو جدیدیت کو غرابت سے بچاتا ہے۔ جدیدیت سے انھوں نے نئی تمثالیں، نئی لفظیات، نیا لب ولہجہ اور نئی حسیت پیدا کی ہے۔ رومانویت سے انھوں نے وہ سبک روی لی ہے جو دل کو موہ لینے والی ہے اور مخصوص کیفیات کا اظہار بن گئی ہے۔

حامد یزدانی کے شعری اسلوب کی تشکیل میں ان کے جرمنی اور پھر کینیڈا کے قیام نے بھی اپنا کردار ادا کیا ہے۔ یہ اثرات ان کی نظم پر

جناب اسلم کولسری، جناب قائم نقوی، جناب حامد یزدانی، جناب حسرت امرتسری، جناب علی اصغر عباس، جناب ساقی گجراتی اور جناب عباس تابش

زیادہ نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظم اور غزل دو مختلف تخلیقی تجربات کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ ان اثرات میں ان خطوں کی تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی فضا اور مغربی ادب کی مختلف اسلوبیاتی ساخت بھی بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ انھوں نے لفظیات اور اسلوب کے ساتھ موضوعاتی حوالے سے بھی ان خطوں کے اثرات قبول کیے ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنے دیگر تمام ہم عصر شاعروں سے بالکل مختلف شاعر نظر آتے ہیں۔ یہ انفرادیت محض انفرادیت نہیں ہے بلکہ اس میں تخلیقی حسن بھی شامل ہے۔ اسی لیے حامد یزدانی کا شمار اپنی نسل کے نمایاں شعرا میں ہوتا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ انھوں نے دیارِ غیر میں بھی شاعری سے اپنا ربط استوار رکھا ہے۔ ''ٹھہری شام کی بیلیں'' حامد کے تخلیقی سفر کی ارتقائی کڑی ہے اور ان کے روشن شعری مستقبل کی دلیل بھی۔

حامد یزدانی کے نام

..........خالد سہیل..........

حامد یزدانی کی
غزلیں اور نظمیں
خوابوں اور دعاؤں کے درمیان
خوبصورت پل بناتی ہیں
مشرق اور مغرب کی ثقافتوں کو
اعلیٰ آدرشوں سے ملاتی ہیں
امن اور آشتی کے نغمے
اور
انسانیت کی عظمت
کے گیت گاتی ہیں
حامد یزدانی کی غزلیں اور نظمیں
ہمارے دلوں کے دروازوں پہ دستک دیتی ہیں
ہمیں کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں
حامد یزدانی کی غزلیں اور نظمیں
اردو شاعری کی منڈیروں پر
نئے امکانات کے دیے روشن کرتی ہیں

☆☆☆☆☆

بازیافت

کہانی بضد ہے کہ اُسے سنایا جائے۔
کہانی؟
کون سی کہانی!؟

جہاز جھاگ اُڑاتے پانی کی لہروں میں سے راستہ تراشتا ہوا کب کا جا چکا۔ دُھند کی دبیز پُراسراریت کے پار۔ پانی کا عکس آسمان پر پڑ رہا ہے۔ آسمان بھی دھندلا ہو رہا ہے۔ نیلے پرندوں کی دُھنیں بارش کی بے ترتیب بوچھاڑ میں مدغم ہو گئی ہیں۔ ہَوا ایک سوال سنسناتی گزرتی ہے۔ کیا کسی نے دیکھا اُسے جو جہاز کے تختے پر بندھا تھا، پھٹے ہوئے پرچم کے نیچے، بھدے رنگ کے مستول کے ساتھ اور مسکرا رہا تھا۔ شاید اس نے کہانی سُن رکھی ہو۔

اور پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے جہاز بھی ایک کہانی میں ڈھل گیا لیکن اُس کے مسافر کردار بننے کو تیار نہ تھے۔ فضا میں عجب بغاوت اُڑنے لگی اور دوسری بارش ہونے سے پہلے ہی تھم گئی۔ ہم نے انھیں دیکھا ہمیں نہ دیکھتے ہوئے۔ دیکھتے بھی کیسے ان کی آنکھیں تو عرشے کی دراڑیوں سے چپکی تھیں۔

جہاز گزر چکا تھا، جھاگ اُڑاتے پانی کی لہروں میں سے راستہ تراشتا ہوا۔ وہ کھیون ہارے کیا سیاہ فام غلام تھے؟ بڑے بڑے چپُو گھماتے ہوئے زور زور سے...... اور زور زور سے۔ خوف اور ملامت کے گھناؤنے پن میں لتھڑے ہوئے ان کے چہروں سے کوئی تڑپ ٹپک ٹپک پڑ رہی تھی۔ ہم نے انھیں دیکھا، لیکن وہ ہمیں نہ دیکھ سکے تھے۔ دیکھتے بھی کیسے...... وہ تو خواب دیکھ رہے تھے اور مل کر گنگنا رہے تھے:

ساحلو! ہم چلے۔ ہم چلے ساحلو
راہ میں جو ملا، راہ میں چھوڑ کر
کوئی دل جوڑ کر، کوئی دل توڑ کر
ساحلو! ہم چلے۔ ہم چلے ساحلو

....

بس ایک وہ تھا جس نے ہمیں دیکھا تھا، بیتے ہوئے ساحل پر کہیں یا گرداب میں۔ لیکن بہت پیچھے۔ ہو نہ ہو کسی خواب میں۔ کون جانے...... تب بھی وہ کوئی گیت گا رہا تھا۔ یا پھر خاموش تھا۔ کہانی سنا رہا تھا۔

حامد یزدانی

خاموشی سے باہر کہانی کا وجود بھی تو نہیں
جیسے غم سے ورا کوئی خوشی نہیں۔
ویسے تو ہم بھیگاتے ہیں، کبھی اپنی مرضی سے
اور کبھی مجبوری میں:
بھورے بالوں کی خوشبو سدا ساتھ ہے
بھیگی باتوں کی خوشبو سدا ساتھ ہے
ساحلو! ہم چلے۔ ہم چلے ساحلو

....

پھر ہم نے دیکھا کہ وہ جو کہانی سنانے کے خلاف تھے سب کے سب ہار گئے اور کہانی آغاز ہوگئی۔
دیکھتے ہی دیکھتے، خوف، نفرت، کھردرے الفاظ بے دریغ گھڑے گئے تاکہ سچ کو جھوٹ کی بڑبڑاہٹ میں دفن کیا جاسکے۔
شاید وہ وہی کچھ چاہتے تھے جو انھیں پہلے ہی مل چکا تھا۔ وہ لہروں کو شکست دیتے ہوئے بڑھتے گئے تھے۔ ہم کھڑے انھیں تکتے رہے۔ گیت گاتے رہے اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ ہمارا گیت ان کے کسی کام کا نہ تھا۔ ہمیں نہیں لگتا کہ وہ اسے سن کر خوش ہوتے۔ انھیں ہماری خوشی سے کچھ غرض نہ تھی۔ وہ تو کسی، خاص خوشی تک پہنچنا چاہتے تھے اور اُسے فتح کرنا چاہتے تھے۔ جشن منانے کے لیے۔ گیت سُن کر وہ خود کو بے مصرف سمجھنے لگتے۔ شاید اُن کے سفر کا نشہ ہی اُتر جاتا۔ اُن کی دلیری سوانگ ٹھہرتی اور اپنی مدھم آواز نہیں شور سنائی پڑتی...... پھر بھی وہ کہیں پہنچنا چاہتے تھے۔ کیا اُن تک جنھیں پایا نہ تھا یا اُن تک جنھیں پیچھے چھوڑ آئے تھے؟
وہ جو تھے مہرباں، جام ان کے لیے
چھوڑ آئے جو گُل فام، اُن کے لیے
ساحلو! ہم چلے۔ ہم چلے ساحلو

....

رہے ہم تو ہمارا جشن تو بس ہمارا گیت ہے جو ہم مناتے رہتے ہیں۔ کبھی اپنی مرضی سے اور کبھی مجبوری میں...... لہجہ بدلتا ہوا جشن جس میں آواز خوشبو بن گئی تھی، رات کی رانی کی مہک نے گلاب کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے اور سورج سے تپی چٹانیں دھرتی کی ٹھنڈک سے ہار گئی تھیں۔
اُفق کی ہلکی ہلکی روشنی شفق کی صورت گہری ہو چلی ہے۔ لہریں سرگوشیاں کرنے لگی ہیں کسی سے۔ بے وقت کے ستارے چھنن چھنن بجنے لگے ہیں۔ چاند کی لے طویل...... اور طویل ہوتی جاتی ہے۔ ایک خوش گمانی دھند سے جھانکتی ہے۔ شاید ہم میں سے کوئی بالآخر پارسائی کا کوئی ٹکڑا پا لے۔ کوئی قدیم سنہری گیت، کوئی ان کہی کہانی جو ہمیشہ سے ہے اور بس پھر سے دریافت ہونا چاہتی ہے۔ بازیافت کی تمنا وقت کی تہوں میں بہتی ہے۔
اپنا لنگر بہت جلد تولیں گے ہم
سُن ہوا! بادباں اپنا کھولیں گے ہم
ساحلو! ہم چلے۔ ہم چلے ساحلو

....

ہمیں لگا جیسے ساحلی ہواؤں نے ہمیں پالیا ہو اور ہم نے کہانی کو۔
ننھی منی کہانی۔ ہم نے اس کی پرورش کی۔ اسے...... اُسے پَر دیئے تا کہ وہ اُڑ سکے۔
کیا ہم واقعی وہاں پہنچ چکے تھے...... کیا ہم تیار تھے۔ صبح کے استقبال کو یا رات کے خیر مقدم کو؟ شاید۔ دھرتی کی خاموش دھڑکنوں کو محسوس کرتے ہوئے آنے والے سفر کے لیے کچھ ہمت پس انداز کرتے ہوئے، پرندوں کی صدائیں ماند کرتی حاسد ہوا کا ایک جھونکا روشنی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ رازداری سے اور پھر آہیں بھرنے لگے تھے۔ اردگرد پھیلی نیم تاریکی کو بدن سے جھاڑ کر باہر نکلنے لگے تھے۔ اپنی پہچان کی آزادی کا جشن منانے۔ لہروں کی سرگوشیاں چہکنے لگیں کنارے کی ریت کے ساتھ ساتھ اُڑتی سفیدی کے جلو میں۔ نظر آواز سے ہم آغوش ہونے کو تھی۔
کیسا عجیب تھا وہ سماں......
جسے ہم دیکھ سکتے تھے لیکن وہ ہمیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دیکھتا بھی کیسے ...... کہانی اپنے آگے کسی کو کچھ دیکھنے بھی تو نہیں دیتی۔
ساحل کی آنکھوں سے دیکھو...... جہاز پھر سے جھاگ اُڑاتے پانیوں میں راستہ نکال رہا ہے۔ دھند کی پُراسراریت کے پار سے۔ پھٹے ہوئے پرچم کے نیچے، مستول سے بندھا وہ مسکرا رہا ہے۔ وہ آدمی ہے یا کوئی گیت یا پھر کوئی کہانی......؟
ایک بہتی ہوئی کہانی، ایک ٹ وٹ ت ی ہوئی کہانی۔
کسے معلوم!
ساحلو...... ہم...... چلے...... ہم...... چلے......
ساحلو
ہم
چلے
ہم
چلے
ساحلو

☆☆☆☆☆

جناب حامد یزدانی، جناب افتخار عارف اور جناب ارشد لطیف۔

ہفت رنگ لہجے میں بولتی روحِ عصر

شعر و سخن سے دلچسپی حامد یزدانی کو ورثے میں ملی چنانچہ شاعری میں حسن و قبح کے بنیادی معیاروں کا شعور تو اُسے، شعوری اکتساب کے بغیر، صرف گھر کی فضا سے حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد پاؤں میں چکر اور سر میں سودائے سخن کبھی ختم نہ ہو سکا۔ خیر اس چکر کا یہ فائدہ ہوا کہ نت نئے تجربات نے موروثی قابلیت کے لیے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور حامد یزدانی کی شاعری صرف قادرالکلامی اور فنی چابکدستی تک محدود نہ رہی بلکہ ذاتی تجربے کی حدت نے اس میں ایک جدت اور انفرادیت پیدا کر دی۔

پندرہ برس ہونے کو آئے ہیں، حامد یزدانی کا اولین مجموعہ ''ابھی اک خواب رہتا ہے'' منظرِ عام پر آیا تھا۔ اس کے حرفِ آغاز میں حامد نے آگ پانی اور ہوا کی طرح شعر، عشق اور خواب کو زندگی کے بنیادی عناصر قرار دیا تھا۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو ''ایک'' نہیں ''ہزاروں'' خواب اُس کی آنکھوں میں ہنوز باقی ہیں جنھیں ایک ایک کر کے رہا ہونا ہے۔ ''گہری شام کی بیلیں'' اسی نامختتم سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ حامد یزدانی بابِ سخن میں یک فنہ نہیں۔ اُس کے پہلے مجموعے میں بھی نظم اور غزل دونوں کی وہ قوسِ قزح موجود تھی جس میں رُوحِ عصر اپنے ہفت رنگ لہجے میں بولتی تھی۔ اُس نے ٹھیک کہا تھا:

فضائے عصر میں اُڑتا ہوا پرندہ ہوں
ہَوا کے رنگ چھپے میرے بال و پر میں ہیں

....

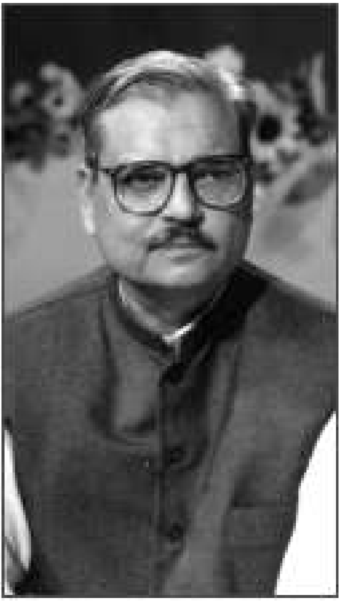

خورشید رضوی

زیرِ نظر مجموعے میں اس دو دھاری تلوار کی کاٹ اور نمایاں ہے۔
حامد کی غزلوں میں روایت کا رچاؤ اور تلازمات کا دروبست طویل ریاضت کا پتا دیتا ہے۔ مگر تغزل کی یہ کیفیت اُس کی نظم میں دخیل نہیں ہوتی۔ دو سمندروں کے درمیان ایک برزخ کی طرح اُس کے ہاں دونوں صنفوں کے مابین ایک واضح حدِ فاصل ہے جو ایک کے لہجے کو دوسری میں در آنے سے روکتی ہے۔
حامد کی نظم ایک تمثال دار آئینہ ہے جس میں صورت کاری کی تازگی دامنِ دل کھینچتی ہے:

"...اک سانس ہے
اس پار یا اُس پار
لیکن خواب کی سب کشتیاں
تعبیر کے ساحل سے کب لگتی ہیں
آنکھوں کے بھنور رستے میں پڑتے ہیں
سفر آغاز کر دو
کیا خبر کب
رفتہ رفتہ تتلیوں کے پر نکل آئیں
جھجکتی پتیوں کے بادباں کھلنے لگیں"
(سفر آغاز ہوگا)

"خواب کی پھول سی مٹھیاں"، "تتلیوں کے پروں پر لکھا خواب"، "درد کی سُرمئی کونج" اور "عمر آلود مائیں" جیسی تصویریں اور تعبیریں ایک انوکھے زرکار تخیل کا سُراغ دیتی ہیں۔ دُور دیس جا کر بس جانے والی اکثر آنکھوں کی طرح حامد یزدانی کی آنکھیں بھی بار بار مڑ کر دیکھنے پر مجبور ہیں۔ "لاہور کے لیے"، "پاپا کے لیے"، "احمد ندیم قاسمی کے لیے" اور ایسی ہی کئی اور نظمیں اس نگاہِ بازگشت کی آئینہ دار ہیں۔ یہ نظمیں اپنی زمین اور اپنے لوگوں سے جڑے رہنے کی خواہش کا اعلامیہ ہیں۔ تاہم ان کا کینوس محض نوسٹلجیا، یامیں اور تُو کے مکالمے سے عبارت نہیں بلکہ ان کی بافت، میں خیال و خواب کے ریشمی تار، شاخ در شاخ تلازمات پر پھولوں بھری بیلوں کی طرح پھیلتے ہوئے کہیں سے کہیں نکل جاتے ہیں۔
مڑ کر دیکھنے کے علاوہ، پردیس کی ایک اور نمایاں کیفیت آئینہ دیکھنے کی ہے جس میں، بسا اوقات، اپنا چہرہ بھی اجنبی دکھائی دینے لگتا ہے۔ "حامد یزدانی" کے عنوان سے ایک بھرپور نظم اسی کرب کی عکاسی کرتی ہے:

"اجنبی! تم کون ہو؟
کس خواب سے آئے ہو؟ بولو!
میرے چہرے سے تمھاری شکل کتنی ملتی جلتی ہے
تمھیں دیکھا ہے پہلے بھی کہیں
لیکن کہاں......؟"
(حامد یزدانی)

پردیس کی یہ کیفیتیں حامد کی غزل میں بھی جابجا ملتی ہیں اور "آئینہ" اور "خواب" کی علامتوں میں بار بار اُبھر کر سامنے آتی ہیں:

کچھ تو شکستِ آئنہ وجہِ ملال تھی
کچھ اپنے خد و خال بگڑنے کا دُکھ بھی تھا
حامد کسی پرانے شجر کی طرح ہمیں
دھرتی سے اپنے پاؤں اُکھڑنے کا دُکھ بھی تھا

☆

رات ساحل سے آ لگی حامد
تم ہو کس خواب کی روانی میں

☆

کچھ ایسا بوجھ تھا حامد مری پلکیں نہ اُٹھتی تھیں
کہ آنکھوں پر کسی کے خواب کا احسان رکھا تھا

....

حامد کی غزل ، وراثت و تجربہ، وہب و اکتساب اور روایت و جدت کے اُسی سنگم پر ایک خوبصورت توازن برقرار رکھتی نظر آتی ہے۔ اُس کے ہاں جذبہ، تجربہ اور کرافٹ سب یکجان ہو کر ایسی برجستگی سے ظہور کرتا ہے کہ شعر سیدھا دل میں اُتر جانے اور ، بسا اوقات ، ضرب المثل کی سی شان اختیار کر جانے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے:

فسانۂ غمِ دوراں پہ اعتراض نہیں
مگر یہی کی حقیقت بہت زیادہ ہے

....

حامد یزدانی کے شاعرانہ خصائص کا تجزیہ کرنے کی اس ادھوری سی کوشش سے دست کش ہوتے ہوئے میں

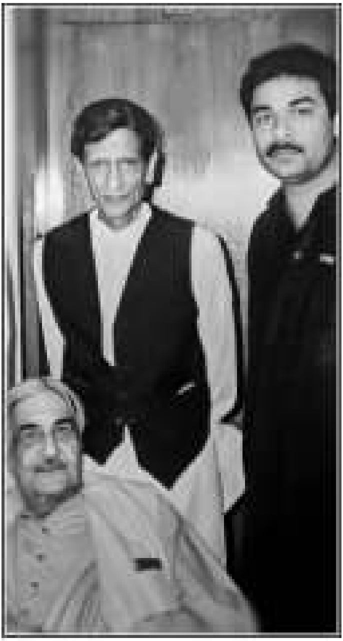

جناب حامد یزدانی، جناب جعفر شیرازی اور جناب وحید قریشی۔

قارئین کو اُس کی صرف ایک مکمل غزل کا حوالہ دینے پر اکتفا کروں گا جو غزل کی روایت پر اُس کی مضبوط گرفت کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ مطلع یہ ہے:

مسافروں کو غمِ رفتگاں پکارتا ہے
پسِ غبار کوئی کارواں پکارتا ہے

....

میں امید کرتا ہوں کہ "دھری شام کی بیلیں" بھی "ابھی اک خواب رہتا ہے" کی طرح اہلِ ذوق میں تحسین کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور حامد یزدانی کو نوبہ نو تخلیقات کا انتظار رہے گا۔
(ملخص)

☆☆☆☆☆

حامد یزدانی: اپنے قصرِ حرف کے آئینہ خانوں میں

حامد یزدانی اگرچہ اب دیارِ غیر میں آباد ہیں مگر وہ اک صحبت یافتہ شاعر ہیں۔انھوں نے اپنی عمر کا اک اہم حصہ وطنِ عزیز میں اپنے دیرینہ احباب کی معیت میں گزارا ہے۔ان کی زرخیز یادوں کا یہ زمانہ، اپنے تمام ترحُسن کے ساتھ ان کے وجود میں ہر ہر لحہ سانسیں لیتا رہتا ہے۔ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے شہرلاہور کے شب و روز بہت یاد آئے۔حامد یزدانی نے اس شہر کو سدا اپنے وجود میں بسائے رکھا ہے۔پردیس میں انھیں لاہور یاد آتا ہے تو کہہ اُٹھتے ہیں:

ٹھہری ہوئی یادوں کا سفر ڈھنگ سے کرتے
یہ شغل بھی اچھا تھا اگر ڈھنگ سے کرتے
ہوتا وہی لاہور، وہی چائے، وہی دوست
ہم لوگ کوئی شام بسر ڈھنگ سے کرتے

....

یا پھر یہ شعر جو خالد احمد کی صحبتوں کے حوالے سے لکھا گیا ہے:

کشش وہ لاہور کے ٹھکانوں میں اب نہیں ہے
کہ ایک خالد بھی چائے خانوں میں اب نہیں ہے

....

ان کی کئی نظمیں بھی اپنے احباب کی محفلوں اور یادوں کے حوالے سے اس مجموعے میں شامل ہیں۔

”نہ جانے کس صدی کے دھیمے دھیمے سُر بکھرتے ہیں
کسی فُٹ پاتھ پر پیلے اجالے سے لپٹتے
کچھ پتنگے قافیہ پیمائی کرتے ہیں
وہ دن بھر کا تھکا رکشا ابھی تک بڑبڑاتا ہے
دھواں! مصرعے کہ لوری؟
پھر وہی بوسیدہ چیٹنگ پھر وہ فرضی دوست
دور کھمبے سے لپکتی، شاید اردو میں لکھی اک ملگجی تختی
ایک بجلی کے لپکتے تار سے الجھی پتنگیں، رات
جیسی گدلی چائے کی ہمکتی بھاپ میں
تحلیل ہوتا، جاگتا سوتا ہوا کیفے ----
ابھی تو ایک دوجے سے گلے ملتی اذانیں مسکرائیں گی

....

حامد یزدانی نے اپنی غزلوں اور نظموں میں اسی دورنگی اور متضاد زندگی کے مرقعے پیش کیے ہیں۔ان کی شاعری میں وقت کے بہاؤ کا ایک ایسا تصور موجود ہے جو ان کی نظموں کو کہیں کہیں اک لازمانی اور لامکانی احساس سے مربوط کردیتا ہے۔ حسیب صادقین کی موت پر لکھی پُراثر نظم ”الوداع“ میں سُرخ رنگ نے شام کے سفید و سادہ ورق پر الوداع درج کردی۔

حامد یزدانی کی شاعری کا خاص وصف وہ سنجیدہ اسلوب ہے جو استعاراتی اور علامتی ہے۔یہ اسلوب عالمی حسیت کا جزو بھی ہے اور

شاہدہ حسن

جناب اشفاق حسین، جناب حامد یزدانی، جناب عرفان ستار اور جناب عطاالحق قاسمی۔

عصری تقاضوں کا جمالیاتی اظہار بھی۔ ان کے شعری اسلوب میں ان کی شخصیت کے کئی پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ وہ گہری فکر کے حامل اک ایسے تخلیق کار ہیں جس نے اپنے عصر اور زمانے کی آواز کو پہچان کر اور اسے اپنے وجود میں سمو کر، اپنے شعری اظہار کے پیکر تراشے ہیں۔ ان کی طویل اور مختصر دونوں ہی طرح کی نظموں میں گہری معنویت ملتی ہے۔ انھوں نے کہیں خود کلامی سے کام لیا ہے اور کہیں اپنے عہد کے اجتماعی شعور سے خود کو وابستہ رکھتے ہوئے اس طرح خود کو قلمبند کیا ہے کہ سارا ہی عہد ان کا مخاطب نظر آنے لگتا ہے۔ بطور خاص اپنی کئی نظموں میں انھوں نے لفظوں کو اُن کے لغوی اور ابھرے معنی کے بجائے، علامتوں اور استعاروں کے طور پر کچھ اس طرح برتا ہے کہ انھیں ہمارے تمدن اور تہذیب کی تاریخ سے وابستہ رکھتے ہوئے ان میں معانی کی نئی جہتیں اجاگر کر دی ہیں۔ ان کلیدی استعاروں اور علامتوں کے علاوہ ان کی شاعری میں موسم، رات، کھڑکیاں، منظر، رنگ، جنگل، وقت، دوپہر، خواب، دُعا، بازگشت، آسمان، راستے اور ایسے ہی الفاظ کہیں انفرادی اور کہیں اجتماعی لاشعور کی کیفیتوں کے ترجمان ہیں۔ ان کی نظموں کی اسلوبیاتی ساخت، لب ولہجہ اور ان کی معنویاتی تشکیل نہ صرف ہمیں متاثر کرتی ہے بلکہ ان کے شعری تجربہ کی انفرادیت سے بھی لُطف اندوز ہونے کا موقع دیتی ہے۔ یہ نظمیں دیرپا تاثر کی حامل ہیں۔

حامد یزدانی جب کسی منظرکشی کے لئے لفظوں اور تراکیب کے دروبست سے گزرتے ہوئے اپنے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں تو خارجی عوامل کے بجائے وہ ہمیں اپنے اندرون اور اپنی باطنی حالت سے آگاہ کرتے ہیں اکثر وہ مابعد الطبیعاتی اظہار سے بھی خود کو وابستہ کر لیتے ہیں اور یوں ایک مستحکم اسلوب کی بدولت ان کی انفرادیت واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔

حامد یزدانی نئے شہروں اور نئے ماحول میں رہتے ہوئے بھی پرانے منظروں کی ایک اک تفصیل

سے ہم رشتگی محسوس کرتے ہیں۔ وہ اپنے لفظوں سے تصویریں بناتے ہیں کیونکہ ان تصویروں میں ان کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی شعور کے بہت سے رنگ نمایاں ہوتے ہیں۔

یہی رنگ ان کی غزلوں کے ان خوبصورت اشعار میں بھی ہمیں ملتے ہیں۔ اُن کی غزلوں کے یہ اشعار دیکھئے:

یہ جہاں کتنا خوبصورت ہے
الاماں کتنا خوبصورت ہے!
یہ پرندے ہٹیں تو دیکھوں میں
آسماں کتنا خوبصورت ہے!
ڈوبتے ڈوبتے کھلا ہم پر
بادباں کتنا خوبصورت ہے!

جو چاہئے جسے لے جائے، راستے کے لئے
یہاں اندھیرا، وہاں روشنی پڑی ہوئی ہے
ابھی ابھی کوئی شاید اُٹھا ہے پڑھتے ہوئے
کتابِ عمر کہ حامد، کھلی پڑی ہوئی ہے

پرانی شال میں قوسِ قزح کو بھرتے ہوئے
زمیں نے آئینہ دیکھا نہیں سنورتے ہوئے

میں تلاوت کر رہا ہوں رحلِ نسیاں پر تمہیں
تم بھی تسبیحِ فراموشی پہ دہراتا مجھے

قرمزی شام کی کھڑکی سے ادھر کچھ بھی نہ تھا
بس ہواؤں کے بھٹکنے کی صدا آئی مجھے

نہ چھت نہ دیوار تھی فقط در بنا لئے تھے
یہ ہم نے کیسے عجیب سے گھر بنا لئے تھے
وہ ایک سادہ سی شام تھی پر کسی نظر نے
اُس ایک منظر سے کتنے منظر بنا لئے تھے

دل بھی اک سنگ ہے دھڑکتا ہوا
ذہن بھی ایک سوچتا پتھر
دستِ آئینہ گر چمک اُٹھا
ایک پتھر گھر رہا پتھر

رکھ دیا آئینہ چراغوں میں
عکس برپا ہوا چراغوں میں
روشنی کب کی مر گئی ہوتی
گر نہ جلتی ہوا، چراغوں میں

ایسے تازہ و رمز آمیز اشعار سے مزین یہ غزلیں حامد یزدانی کی تخلیقی زرخیزی کا ثبوت بھی ہیں اور اردو زبان و ادب سے ان کی دیرینہ عقیدت و محبت کی مظہر بھی۔۔دیارِ مغرب کی فضاؤں میں رہ کر بھی وہ زندگی کی کلیت سے جس طرح خود کو وابستہ رکھتے ہیں اور اپنے افکار اور محسوسات کا جو جہانِ خوش رنگ آباد کیے ہوئے ہیں اس پر وہ قابلِ صد مبارکباد ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا یہ تازہ شعری مجموعہ "ہم ابھی رستے میں ہیں" بھی ان کی سابقہ تصانیف کی طرح، اہلِ فکر و دانش کی جانب سے بھرپور پذیرائی کا مستحق قرار پائے گا۔

☆☆☆☆☆

کہانی کی آنکھ سے دیکھی گئی کہانیاں

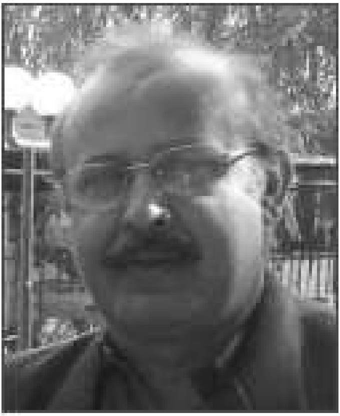

زاہد حسن

حامد یزدانی اپنے ہر افسانے میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے لیکن ہر افسانے سے باہر اپنے کرداروں اور ان کے حالات و واقعات کو قابو میں رکھتے ہوئے۔ اس مجموعہ میں شامل سبھی کہانیاں اپنا خمیر ان جگہوں، لوگوں، موسموں اور ان حالات سے اُٹھاتی ہیں، جو سمے کی صورت اس کی زندگی کی دہلیز سے ہو کر گزرے، اور سمے کے بے رحم تھپیڑوں نے انھیں دھول اور دھند کی صورت بہتے ساگروں کے سپرد کر دیا ہے۔ ان کہانیوں میں لاہور تو ہے، جرمنی، جرمنی کے شہر، یورپ اور پھر کینیڈا۔۔۔ اس دوران جن خطوں کے لوگ اس سے ملے اور مل کر بچھڑے، وقت اور لوگوں کے ذریعے جو کہانیاں اور کردار اس سے ملے اور ان کہانیوں کا حصہ بنے وہ سب فطری طور پر اور تخلیقی انداز میں ان کہانیوں میں بسیرا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی اس کی انفرادیت ہے۔ یہاں ایک طرف دیوار برلن، جرمنی کے اتحاد کا امین برینڈن برگ گیٹ ہے اور ایبٹ آباد کے ایک فرضی گاؤں باندی ڈوراں کا فضل جو دیوار برلن کے ٹکڑے بیچ رہا ہے اور جو ٹکڑا مرکزی کردار لیتا ہے وہ وچھوڑے کی نشانی ہے اور اس پر رنگوں کی آمیزش میں عبرانی زبان میں ''گریہ'' درج ہے۔ یہاں دیوار، دراصل جدائی اور فراق کی تاریخی علامت بن کر آتی ہے جو بظاہر دو ملکوں کے اتحاد کے سائے میں کہانی کے مرکزی کردار اور اس کے دوستوں کے درمیان فراق کی داستان سناتی ہے۔ اس کی ایک اہم اور عمدہ کہانی ہے ''خاکی تھیلا'' جس کا منظر نامہ ہمیں قصبہ وائرڈاؤن کی داخلی اور خارجی سیر کرواتا ہے جب وہاں ہوا بند تھی اور جولائی کا نارنجی سورج غروب ہونے والا تھا۔ ''خاکی تھیلا'' میں وبا کے دنوں کو نہایت عمدگی اور تخلیقی انفرادیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

''ٹیوب'' بھی ایسی ہی ایک اور کہانی ہے

جناب امیر حسین جعفری، جناب حامد یزدانی، جناب خالد اقبال یاسر، جناب افضال نوید اور جناب طاہر اسلم گورا۔

جس میں مختلف فوبیاز کا شکار کہانی کا مرکزی کردار اپنی چھٹیاں گزارنے جرمنی سے لندن یعنی انگلستان آیا ہوا ہے اور ٹیوب یعنی وہاں کی انڈر گراؤنڈ ٹرین میں اپنی فیملی کے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ اور سفر کے دوران بے شمار حادثات اور ان سے مجھے خدشات کو افسانہ نگار نے جس عمدگی کے ساتھ لکھا ہے اس انداز میں لکھنا قطعاً آسان نہیں ہوتا۔

ایک ہجرت کرنے والے کے طور پر مہاجرت اور پھر برسہا برس وہاں رہنے کے بعد بھی تارکینِ وطن کے نفسیاتی اور سماجی مسائل جو حل ہونے میں ہی نہیں آتے، اس کو ''دروازہ'' سمیت دیگر افسانوں میں بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ دو افسانے جوان موضوعات سے نسبتاً ہٹ کر ہیں ''مرغولے'' اور ''کوے'' ہیں، افسانہ ''کوے'' تو انسانی جبلت کے اس گوشے کو وا کرتا ہے جو انسانی لاشعور میں خوابوں اور اندیشوں کی صورت میں ہمیشہ ادھ سویا، ادھ جگا رہتا ہے۔ خوابوں کی نیم غنودہ علامتوں کے ذریعے اسے خوب صورت طریقے سے بنا گیا ہے اور بدعنوانی جیسے سماجی مسئلہ کو بھی اس میں اجاگر کیا گیا ہے۔ اور جہاں تک ''مرغولے'' کی بات ہے۔ افسانے کے اندر، افسانہ اور افسانے کے مرکزی کردار نوآموز افسانہ نگار کا احوال بھی خوب ہے تاہم اس کا بیانیہ تو خوب تر ہے۔ حامد یزدانی کے افسانوں کے مطالعہ کے بعد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ افسانے نہ صرف اپنے موضوعات، زبان و بیان بلکہ اپنی تکنیک کے اعتبار سے بھی ہم پر اک جہانِ نو کے در وا کرتے ہیں۔ یہ جہان تو بظاہر ہمارے افسانہ نگار کے تجربہ اور مشاہدہ میں رہا ہے تاہم اب ہم بھی اس کے ذائقوں، رنگوں اور لطافتوں سے ہم آہنگ و آشنا ہو سکتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

تحت الشعور سے ابھرتی قرمزی شام جیسی نظمیں

شعور، لاشعور--- لیکن ان دونوں کے بیچ کہیں تحت الشعور بھی تو پڑتا ہے- انسانی نفسیات کہہ لیجیے یا کیفیات--- لیکن جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو یہ سب میری قدرت سے بالا بالا ہے- مجھے جو نظر آتا ہے، دیکھے جاتا ہوں، جو سنائی دیتا ہے، سنے جاتا ہوں اور پھر یہ سب میرے ہاتھ سے ریت کی طرح پھسلنے لگتا ہے، کہیں دور--- دور، جسے ایک تاریک گوشے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے شاید لاشعور، جہاں خود ڈھونڈے کچھ نہیں ملتا، ہاں کبھی کہیں کوئی ایسی واردات ذہن ودل پر وارد ہو جائے تو اس نہاں خانہ سے حسبِ حال کچھ نہ کچھ برآمد ہونے لگتا ہے- یہ برآمد بھی جگسا پزل کی سی برآمد کے مانند ہوتی ہے- کہیں یہ خوابوں میں جلوہ فگن ہونے لگتی ہے تو کہیں--- دراصل میں اور حامد یزدانی تو جاگتے میں بھی خواب دیکھنے کے عادی ہیں- ہم دونوں کبھی نہیں ملے--- مگر لگتا ہے کبھی بچھڑے بھی نہیں- یہ کیسے ہوسکتا ہے؟، یہ بات بھی آج تک میری سمجھ سے بالا بالا ہی کسی اور بات کا روپ دھار لیتی ہے- بات ہو رہی تھی جاگتے میں خواب دیکھنے کی تو میں اور حامد یزدانی سوتے بھی کہاں ہیں سو وہ خواب جو عالمِ رویا میں ہمارا نصیب ہونا لکھے گئے تھے، ہمیں جاگتے میں دیکھنا پڑ جاتے ہیں- ہمارے خواب دن رات کی قید سے آزاد ہیں-

اِس وقت بھلا میں جاگ رہا ہوں یا سو رہا ہوں؟ رات کا ڈیڑھ بجا ہے- افرادِ خانہ گہری نیند میں ہیں- بیٹا اچانک نیند سے بیدار ہوتا ہے--- ایک محبت بھرا پسرانہ 'حکم' اور میرے سامنے گھر سے مارکیٹ تک کا سفر پھیل جاتا ہے--- باہر شدید سردی ہے- گاڑی گرم ہوتے ہوتے بھی وقت لے گی، شدید دھند --- سیاہی مائل دھند --- سموگ؟--- افوہ، فٹ پاتھ تک دکھائی نہیں

نوید صادق

دے رہا۔ لیکن عجب منظر مقابل ہے۔ دور دور تک کسی ذی روح کا نام ونشان تک نہیں، سڑک کے دونوں کناروں پر نیم غنودہ روشنیاں--- کہیں یہ بھی میری طرح اپنے وجود کی بقا کی جنگ تو نہیں لڑ رہیں، لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔ اور وہ سامنے خدا کا گھر--- پہلے تو یہ دور سے واضح دکھائی دینے لگتا تھا، آج اسے کیا ہو گیا--- کچھ دھند اور کچھ شاید میری کم بصری--- ایسے میں میرے دل و دماغ پر ایک اور ہی طرح کی کیفیت سایہ گیر ہونے لگتی ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ کون ہے؟ ارے یہ تو حامد یزدانی کی نظمیں ہیں۔ پیش منظر میں پھیلتے سمٹتے پراسرار کینوس پر ہیولوں کی طرح رقص کرتی، چھپتی، ابھرتی، بہتی، اچھلتی، کھلتی، جھجکتی نظمیں۔ یہ ایک تحیر خیز دنیا ہے، عجیب ماجرا ہے۔ ہاں، اس بھیدوں بھری دنیا کو بسانے والا --- کینیڈا میں بسا میرا دوست حامد یزدانی ہے۔

''بہت ٹھنڈ ہے اور بہت دھند بھی۔ چلیں، گھر چلتے ہیں'' لیکن یہ مشورہ اس وقت میں نہیں مان سکتا۔

''تم جاؤ، مجھے کچھ وقت اس خوبصورت ماحول میں بسر کرنا ہے۔''

''یہاں؟ اس وقت؟ اکیلے؟ عجیب بات ہے!''

''میں اکیلا تھوڑی ہوں، حامد بھائی کی نظمیں میرے ساتھ ہیں۔''

''آپ جائیں اور آپ کا کام---''

اب یہاں میں ہوں، شدید سردی ہے اور دھند میں لپٹا منظر--- جلدی میں جیکٹ بھی گھر بھول آیا ہوں، لیکن یہ فضا کچھ دیکھی دیکھی سی لگ رہی ہے، بہت سی چیزیں مانوس معلوم پڑتی ہیں۔ ''قرمزی شام''--- رات کے اس پہر کھلے آسمان تلے ڈھلتی رات جانے مجھے شام، ایک ''قرمزی شام'' کیوں لگنے لگی ہے!

سڑک پر--- بھٹکتی ہوئی روشنی
ادھ کھلی کھڑکیوں سے اِدھر--- غیر ملبوس
میداں--- تراشی ہوئی گھاس--- پُر نم خوشی
کہ شفاف اندھیرا
طراوت بھی--- کم ہوتی جاتی ہے، شاید
یہ رات--- شاید--- مجھے کچھ سمجھانے کی

کوشش میں ہے۔ میری تنہائی کے دروں خانہ کہیں کوئی بھیڑ لگی ہے، لیکن یہ کیسی بھیڑ ہے، میں کوئی چہرہ پہچان بھی تو نہیں پا رہا۔ لیکن یہ مناظر مجھے کچھ کچھ یاد بھی دلا رہے ہیں۔ کوئی بہت پرانی بات، کوئی حال کا قصہ--- دھیان کے قرطاس پر دستکیں دینے لگا ہے۔ کچھ ایسا ہے جیسے یہ ماحول، یہ منظر اور حامد یزدانی کی نظمیں کسی خواب کو پھر سے صورت گر کر کے میرے سامنے لانے کی دھن میں ہیں۔ گویا یہ سب مل کر میرے لاشعور سے کچھ برآمد کرنے کے چکر میں ہیں۔ یہ تو کوئی خواب ناک سی فضا بنتی چلی جا رہی ہے:

کیا رات ہے!
نوکیلے تاروں میں الجھا تاج نما اک چاند ہے

اور بے رنگ ---
کہ پل پل رنگ بدلتا اک ہالہ ہے!

....

میں دن کی روشنی میں کئی بار یہاں آیا گیا ہوں، پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔ ایک دن ہی کا کیا ذکر کہ ایسی ہی سردی اور دھند میں میں شاید گذشتہ برس یا پھر اس سے بھی پہلے کئی بار گزرا ہوں، لیکن آج --- یاد آیا پہلے "قرمزی شام" کے مطالعہ کے دوران میں اٹھ کر نہیں آیا تھا، آج تو نظموں کی لائنیں دھڑا دھڑ جگ ساپزل کی صورت میرے گرد پھیلی دنیا سے گھل مل کر کوئی نیا تو یلا منظر بنانے کے چکر میں ہیں۔ اور پھر کچھ کھٹی میٹھی یادوں کے عکس میرے دھیان کے پردے پر بھی ابھرنے لگے ہیں۔ کہیں کوئی انبساط کا پہلو لیے ہے تو کہیں کوئی --- حامد بھائی! یہ آپ نے مجھے کس دنیا میں دھکیل دیا ہے! چور کی طرح کمرے کی چھت پر کسی کے قدموں کی پراسرار چاپ سے ابھرتا ڈر --- سیڑھیوں سے اترتا سایہ --- کس کا؟ شاید میرا ہی سایہ --- میری تلاش میں --- یا شاید میں اُس کی تلاش میں:

رات بھر رہتی ہے مجھ کو مرے سائے کی تلاش
ڈھونڈتا رہتا ہے مجھ کو مرا سایا دن بھر

یہ تلاش --- کبھی ختم بھی ہوگی کہ نہیں، یہ تلاش آگے سے آگے پھیلتی جاتی ہے اور عمر کے دن --- لیکن شاید اسی کا نام زندگی ہے کہ ادھر تلاش کا عمل ختم --- اُدھر! ایک کش مکش سی سارے کو محیط ہے۔ اس کش مکش میں کچھ عجیب ہے، بہت عجیب --- اسے خوف ملا انبساط --- ہاں یہی نام مناسب ہوگا۔
اور پھر دن یاد آنے لگتے ہیں پہلی ہجرت کے --- بہاول پور سے لاہور --- جامعہ ہندسیہ --- راتوں کو دیر تک یونیورسٹی کی سڑکوں پر گھومنا، کبھی اکیلے، کبھی دوستوں کے ساتھ --- گھنے درختوں کے بیچوں بیچ فوارے کے ایک طرف اکیلے بیٹھے رہنا، کبھی کبھی تو صبح کے آثار دکھائی دینے لگتے --- 'یہ درخت میری طرف کیوں جھک رہا ہے، اسے کیا ہوگیا ہے، ہوا بھی نہیں، بھاگو!' --- لیکن کتنا بھاگوں گا! تھک جاؤں گا، گر جاؤں گا، پھر؟ --- پھر کیا ہوگا، یہ شعر تو مجھے بچانے سے رہے۔ یہ کیا!؟ یہ درخت نے عجیب سی شکل کیوں دھار لی ہے۔ کوئی گڑ بڑی ہے۔ مجھے بھاگنا ہوگا یہاں سے مگر ---'

کوئی دروازہ نہیں تھا
ایسے قصبے
ایسے قصبے میں
کتنا بھگائیں گے مجھے آپ، حامد بھائی؟

اک ذرا باہر کیا نکلا کہ "قرمزی شام" اور دھند بھرے منظر کے دوہرے سحر نے جکڑ لیا ہے:

شام کی صبح ہوگئی یک دم --- یہ تو کچھ ہم نے
خواب سا دیکھا (نظیر اکبرآبادی)

حامد یزدانی کی نظمیں اور سارے میں پھیلی کائنات ہی کیا کم تھے کہ ایک دم میاں نظیر بھی ہم قدم ہو لیے ہیں۔ کچھ اشتراک ہے

شاید--- یا میں--- یہ کون دنیا ئیں ہیں--- دھند میں لپٹے خواب ناک مناظر، قرمزی شام--- حامد یزدانی کی نظمیں، نظیر کی نظمیں--- مجھے نظیر اور حامد یزدانی میں ایک اختلاف بھرا اشتراک محسوس ہونے لگا ہے۔ اور وہ یوں کہ نظیر اکبر آبادی اپنی نظموں کی حد تک شعور کے شاعر ہیں اور حامد یزدانی اپنی نظموں میں شعور اور لاشعور کے بجائے تحت الشعور کے شاعر ہیں۔ یعنی نظیر وہ بیان کر رہے ہیں جو وہ دیکھ رہے ہیں، جو وہ سن رہے ہیں، لیکن حامد یزدانی کا مسئلہ تھوڑا ٹیڑھا بھی ہے اور کچھ کچھ مشکل بھی۔ مشکل یوں کہ شعور سے لاشعور تک بہت کم دورانیہ ہوتا ہے اور مختصر دورانیہ ہی میں کہیں تحت الشعور پڑتا ہے۔ گویا یہ دیکھے سنے کے معدوم ہونے سے چند لمحے پیش تر کی بات ہے۔ حامد اسی قلیل دورانیہ میں ان معدوم ہوتے مناظر، مٹتی ہوئی صورتوں کو تصویر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور میں تو یہ تک کہہ جانا چاہتا ہوں کہ حامد یزدانی نے بہت سے مناظر کو لاشعور کا حصہ ہی نہیں بننے دیا، لیکن شعور میں بھی تو ان کے قیام کی کوئی وجہ یا جگہ نہیں نکلتی، سو مجھے کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ حامد یزدانی نے اپنے تحت الشعور کی حدیں بہت وسیع کر رکھی ہیں جبھی تو--- یہاں ماہرین نفسیات سے سوال بنتا ہے کہ--- لیکن سر دست میں اس سارے میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتا۔ ایسا کوئی سوال اٹھتا بھی ہے تو میرے پاس اس کا ایک ہی جواب ہے کہ مضبوط اعصاب اور خلاق طبع کا مالک کچھ بھی کر سکتا ہے--- وہ بھی جو عام انسانوں کے فہم سے بالا ہوتا ہے۔ یوں دیکھوں تو حامد یزدانی مجھے تحت الشعور کا شاعر لگتا ہے۔ ایک گہرا شاعر--- جو زندگی کی الجھی ہوئی کیفیات کی ڈوری میں تخلیقی رنگوں سے مزید گرہیں لگانے میں مگن ہے۔ ہو سکتا ہے ہمیں دکھائی دینے والا یہ الجھاؤ اُس کی دنیا میں سلجھاؤ کہلاتا ہو۔ کیا پتہ!؟

ممکن ہے یہ باتیں اہلِ علم کے نزدیک اہمیت کی حامل نہ ہوں، دوسری صورت میں اختلاف کی گنجائش بھی نکل سکتی ہے لیکن بہتر یہی محسوس ہو رہا ہے کہ میں اس فکر میں الجھے بغیر اپنی راہ چلتا رہوں۔ اس منفرد شاعری کے ساتھ کچھ اور سفر کروں۔ اپنا کیتھارسس کرلوں--- میرے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے، کیتھارسس کا عمل تو کب کا شروع ہو چکا ہے۔ اب دورانِ سفر آپ بھی چاہیں تو بخوشی شریکِ مطالعہ ہو سکتے ہیں۔ یوں ہم تہہ در تہہ پیچھی ان بظاہر بے ترتیب راہوں کو جو 'قرمزی شام' میں تخلیقی جالے کی طرح جانے کہاں سے کہاں پھیلی ہوئی ہیں، مل کر طے کر پائیں گے۔

ویسے ایک راز کی بات بتاتا چلوں کہ یہ نظمیں تحلیلِ نفسی کے کسی ماہر کی صورت پہلے قاری کے شعور پر حاوی ہو کر، اسے موجود سے دور لے جا کر انتشار کی شدید حالت میں لے جاتی ہیں، اور اس کے بعد

واپسی کا سفر۔۔ لیکن واپسی کا یہ سفر یوں ہی نہیں کہ تحلیلِ نفسی کے ماہرین اسی طور کسی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ چلیے علمِ نفسیات سے ہٹ کر بات کرتے ہیں تو یوں ہے کہ ایک ایسے شخص کو دھیان میں لائیے جو فنِ تیراکی سے آشنا نہیں لیکن دریا اسے اس طور اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے کہ وہ دریا میں چھلانگ لگا دیتا ہے، کچھ دیر موجوں سے کش مکش کے بعد صورتِ احوال قابو میں آ جاتی ہے، تہہ میں پڑے نایاب گہر اس کو دکھائی دیتے ہیں اور واپسی کے سفر میں۔۔۔ حاصل اس تجربہ کے دوران پیش آنے والی مشکلات کی یادوں کی تلخی زائل کرتا محسوس ہوتا ہے۔

حامد یزدانی کی نظموں میں ایک چیز جو بار بار اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے وہ ان کی نفسیات میں اردگرد کے ماحول اور صورتِ احوال کے زیرِ اثر پیدا ہونے والے تضادات اور کشمکش کا محاکانہ اظہار ہے۔ ان تصویروں سے بظاہر دھیان اور طرف متوجہ ہوتا ہے، مصرعے پرت دار ہوتے جاتے ہیں، معانی وسیع ہوتے دکھتے ہیں، لیکن اندر کھاتے ایک تجزیاتی ذہن۔۔۔ تجزیہ کے بعد نتیجہ کی طرف سفر کی کٹھنائیاں آشکار ہوتی ہیں۔ تخیل کے سہارے کی جانے والی شاعری بسا اوقات علامات کا گورکھ دھندہ بن کر رہ جاتی ہیں اور جدید اردو شاعری بالخصوص نظم کے معاملے میں تخیل کے نام پر جو گل کھلائے گئے ہیں وہ اردو نظم کے باشعور قاری سے پوشیدہ نہیں،

لیکن حامد یزدانی کی خلاق اور محتاط بلکہ متوازن طبع نے ان کی نظموں کو اس عیب کا شکار ہونے سے بچائے رکھا ہے۔ اس صورتِ احوال ہی کا ایک اور پہلو جو الجھتے الجھتے ایک مرض کی صورت اختیار کر لیتا ہے، وہ انسان کا اس سارے سے مغلوب ہو جانے کا عمل ہے۔ حامد یزدانی کی شاعری میں اکثر و بیش تر غالب و مغلوب ہر دو صورتوں سے گریز کی صورت ایک متوازن طرزِ فکر کی راہ ہموار کرتی نظر آتی ہے۔

اداس لیمپ پوسٹ کی\
تھکی تھکی سی روشنی\
بجھے درخت کی سلگتی اوٹ میں\
کھلی کھلی\
مہک\
دھواں\
اُڑا کے لے گیا ہے کون\
چاند کو\
خبر نہیں\
اب اور کتنی بار\
پریں رات کا ٹوٹکا لیے\
ہتھیلی پہ سجے بلیک بیری پر\
ای میل اپنی کھولیے!\
نیٹ ورک آج خوب ہے\
کسی سے بات کیجیے\
کسی سے کچھ تو بولیے

....

تمازتِ دھوپ کی ہو

جناب انتظار حسین، محترمہ طاہرہ اور جناب حامد یزدانی۔

چاندنی محسوس ہوتی ہے
کہ جیسے اجنبی تعبیر اپنے خواب سے
مانوس ہوتی ہے

....

لیکن یہ سب یونہی ممکن نہیں ، یہ سفر اتنا آسان بھی نہیں کہ خود اعتمادی اور خلاق طبیعت اس سارے کے لیے بنیادی شرائط میں داخل ہیں۔ منتشر ہونے کا حوصلہ درکار ہوتا ہے۔ ممکن ہے انتشار کی کیفیت سے واپسی کا سفر ممکن نہ ہو پائے--- اور ایسے میں بالکل متضاد صورتِ احوال کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ ایک مستقل ذہنی خلفشار--- جس کا شکار لوگ--- نہ ادھر کے رہ پاتے ہیں نہ اُدھر کے!

حامد یزدانی کی نظموں میں مذکورہ بالا کیفیات کے دوران ایک اور خاص چیز جو قاری کی توجہ اپنی جانب کھینچتی ہے، وہ ماحول میں بظاہر کسی پراسراریت کی عدم موجودگی کے باوجود تصویر کو پراسرار بنا دینے کے فن میں مہارت کا عمل ہے۔ کولرج کہتا ہے کہ ہر چیز میں پراسراریت کا رنگ ہوتا ہے۔

حامد یزدانی نے اپنی نظموں میں اپنے اردگرد کے خاص و عام مناظر سے رنگ بھرے ہیں، تصویریں بنائی ہیں اور ان تصویروں میں ان کے مخصوص لب ولہجہ اور خلاقی طبع نے ایک خاص نوع کی پراسراریت کو جگہ دی ہے جس سے ان نظموں کی Readability دوچند ہوگئی ہے۔

حامد یزدانی کی ان تازہ نظموں پر مزید گفتگو ہوسکتی ہے، دعووں کے حق میں بطور دلیل کئی کئی نظمیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن طولِ کلام سے گریز کرتے ہوئے قاری کے لیے اشارات بہم پہنچانے پر اکتفا کرتے ہوئے اختتام کی طرف قدم بڑھاتا ہوں کہ اس سے آگے قاری کا اور میرا سفر الگ الگ راہوں پر بھی تو ہوسکتا ہے، اور میں زیادہ باتوں سے ان نظموں میں موجود امکانات کی دنیا کو محدود نہیں کرنا چاہتا۔

☆☆☆☆☆

نظم

ایک بوڑھے اگست کا قضیہ
گٹھڑی گٹھڑی
ماضی کے سائے باندھے
اک ستراِئی ہجرت
ان لاکھوں وعدوں کے ساتھ سفر میں ہے
جو صدیوں کی خواب مسافت کی تکمیل کریں گے
شاید کچھ تبدیل کریں گے!
دھرتی تاریخی ہے یا پھر اس کا غم؟
یہ کون بتائے
بچھڑی ہوئی راتوں کی ریت پہ خوابیدہ سانس
نوحہ نوحہ زرد صدائیں
کیکر کیکر چھدتی جائیں
کچھ بے رنگ پرندے
یا شاید کچھ جھنڈے۔۔۔ شاخوں میں الجھے ہیں
صبح کی یہ بوسیدہ حیرت
راوی کی گم گشتہ لہریں
یادوں کی بے سمت ہوائیں
اک خالی پن کو دوہرائیں
دل کے مہاجر خیمے سے اٹھتا بے کیف دھواں
بے معنی تائید کی گیلی سی زنجیر
لکھنے سے پہلے مٹتی جاتی تحریر
جدائی؟ ہجر؟ کہ ایک سفید اُفق؟
دُور کہیں جلتی آبادی
کچی پکی دھوپ سے رستے پر اٹھلاتی
دھول اڑاتی، جشن مناتی اک آزادی!
بوجھل سر سے ڈھلکتی جائے
شفق شفق دستار
لمحوں کے اس پار

حامد یزدانی

خود۔ جزیرہ رات کا آخری مشورہ

بس اب بھاگنا بند کرو
کیا رات ہے!
نوکیلے تاروں میں الجھا تاج نما اک
چاند ہے
اور بے رنگ۔۔۔
کہ پل پل رنگ بدلتا اک ہالہ ہے!
رک جاؤ
اب رک جاؤ
بھاگنے سے کیا فاصلے کم ہو جائیں گے؟
سچ مانو، تم تھک ٹوٹ چکے ہو
بریف کیس کو تھامے ایسے بھاگتے
بھاگتے،
ہانپتے ہانپتے
یہیں، یہیں، بس یہیں رکو
اس مین ہول کا ڈھکن کھینچو
ہاتھ میں تھامے بریف کیس کو اندر پھینکو
وہ بے رنگ۔۔۔
کہ پل پل رنگ بدلتا ہالہ نیم غنودہ ہے
مسنون دعا دوہراؤ

لیکن دھیان رہے۔۔۔
تیز ہوائیں۔۔۔ سانسیں چیخ نہ جائیں
یہ سمٹی سمٹائی زندگی بکھر نہ جائے
ٹائمز اسکوائر
شیلڈ رگا سے
ینگ اسٹریٹ
ریگل چوک میں
اس فٹ پاتھ پہ دھرنا مارے
منگتے کے قدموں میں
آئی فون، روابط، چیٹنگ
لین دین کے عددی کھاتے
آدھی پنسل، خالی خولی چیک
ایرو بکس گائیڈ
جان ایف کینیڈی: ایک سوانح
یہ کل کا اخبار، پھٹے تقویمی زائچے
اور وہ۔۔۔ وہ سب
وہ سب کچھ بھی بکھر نہ جائے
دھیان سے۔۔۔ دیکھو
کب تک بھاگتے جاؤ گے؟

حامد یزدانی

یوں خود سے۔۔۔یا پھر جانے کس سے!
بھاگنے سے کیا فاصلے کم ہو جائیں گے!؟
رُک جاؤ
بریف کیس سے جان چھڑاؤ
وہ بے رنگ کہ پل پل رنگ بدلتا ہالہ اب
بھی نیم غنودہ ہے
مسنون دعا دوہراؤ
جلدی سے تم
مین ہول کا ڈھکن کھینچو
اور بس۔۔۔پھر
آسمان کو دیکھو!
دونوں بازوؤں کو۔۔۔آزادانہ حرکت
دیتے
ہونٹ سکیڑ کے سیٹی بجاتے
مال روڈ کے بیچوں بیچ چلے جاؤ
یوں بھی ٹریفک کم ہے
شہر میں
خوف زیادہ ہے
اتوار ہے۔۔۔شاید آج
مگر سوموار بھی ہو تو کیا ہے!
کوئی تمھارا کیا کر لے گا!؟

دوپہر

حامد یزدانی

دوپہر اک دریچہ ہے
پت جھڑ کی جانب کھُلا
اک دریچہ
کچن کا
چمکتا ہوا فرش
ڈھیلی ڈھالی، لڑھکتی ہوئی دھوپ
ڈھلنے کو ہے عام سا ایک دن
ہلکی خاکی ہَوا
تیز ہوتی ہوئی
ریتلی آس
معدوم ہوتی ہوئی
آنکھ میں
پیڑ
کُنجی ہے اُس صحن کی
جس کے پہلو میں ٹھہرا ہے
دریا
تری یاد کا
عام سا ایک دن
ایک کھڑکی
ہَوا۔۔۔
ہلکی خاکی ہَوا
دوپہر

ڈے، لائٹ یا سیونگ

اُدھڑتی ہوئی اک خنک شب
سُکڑتی ہوئی، پھیلتی، سُست رو
پھر سے
کچھ بھی نہیں
بانٹنے کو۔۔۔ کسی سے
لبالب۔۔۔ چھلکتی ہوئی
بھیڑ میں
ایک میں ہی تو شامل ہوں
گاڑھی سی یہ جھنجھناہٹ
سڑک پر
بھٹکتی ہوئی روشنی
ادھ کھلی کھڑکیوں سے اِدھر
غیر ملبوس۔۔۔ میداں
تراشی ہوئی گھاس
پُرنم خوشی کہ شفاف اندھیرا
طراوت بھی کم ہوتی جاتی ہے، شاید
مگر کیا کریں ہم
فریج پر جمی نیلی فہرست:
بل کی ادائی
سکینر مرمت کو بھیجیں
نئے ڈاکٹر سے ملاقات کا وقت تبدیل کرنا ہے
تازہ غزل فیس بک پر لگانا ہے
گھڑیوں کو اک گھنٹہ پیچھے گھمانا ہے
اک فون کرنا ہے
لاہور۔؟
کولون۔۔؟
ڈھاکا۔۔۔؟

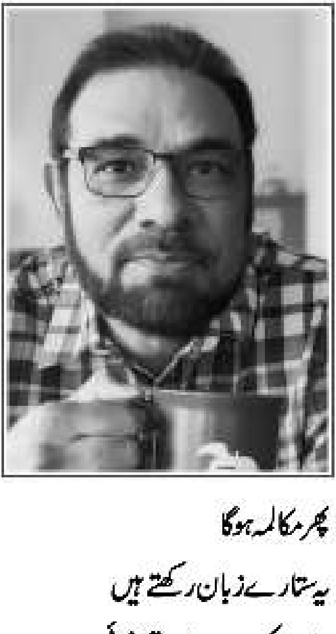

حامد یزدانی

ایک تنہائی

رات کو
آسمان کہتے ہیں
یاد کو بادبان کہتے ہیں
ڈھلتے بادل کو خواب کی کشتی
استعارے زبان رکھتے ہیں
شب ڈھلے
پھر مکالمہ ہوگا
یہ ستارے زبان رکھتے ہیں
چاند، اک بے زباں تماشائی
تا بہ لاہور۔۔۔ ایک تنہائی!

نذرِ یزدانی جالندھری

سُن کے جھنکار سی صدا، پتھر
بات کرتے ہیں بارہا پتھر

کیسی بہتی ہوئی کہانی تھی!
ایک کردار ہو گیا پتھر

جانے کس قیس کی تلاش میں ہے!
یہ خلاؤں میں گھومتا پتھر

دل بھی اک سنگ ہے دھڑکتا ہُوا
ذہن بھی ایک سوچتا پتھر

دستِ آئینہ گر چمک اٹھا
ایک پتھر نگر رہا پتھر

پھر سے قسمت مری اٹھا لائے
لائیے کوئی دوسرا پتھر

عکس کس سنگ دل کا ابھرا تھا
آئنہ پھر سے ہو گیا پتھر

ایک پتھر تھا، ایک دل، حامد!
میں نے بے ساختہ چُنا پتھر

نذرِ خالد احمد

کشش وہ لاہور کے ٹھکانوں میں اب نہیں ہے
کہ ایک خالد بھی چائے خانوں میں اب نہیں ہے

یہ بات سمجھائے کون اس سر پھری ہوا کو
جو صبر ہوتا تھا بادبانوں میں، اب نہیں ہے

مِرے ہدف تُو بتا کہاں ہیں؟ جو کہہ رہے تھے
لچک وہ پہلے سی ان کمانوں میں اب نہیں ہے

وہ نور تو اب بھی منتظر ہے فلک پہ حامد
کُھلا کہ دم خاک کی اڑانوں میں اب نہیں ہے

حامد یزدانی

غزلیں

حامد یزدانی

پُرانی شال میں قوسِ قزح کو بھرتے ہُوئے
زمیں نے آئنہ دیکھا نہیں سنورتے ہُوئے

مِرے خیال کے سب رُوپ، اپنے حُسن کی دھوپ
وہ لے اُڑا ہے، مِرے خواب سے گزرتے ہوئے

کہیں جو گھر سے اُدھر بھی مِرا ہی گھر نکلا!
ٹھٹھک گیا تھا میں دہلیز پار کرتے ہُوئے

ترے مزاج میں صحرا بسا دیا کس نے؟
غبار پوچھ رہا ہے مجھے بکھرتے ہُوئے

دبک کے خیمۂ نسیاں میں بیٹھ رہتے ہیں
ہم اُس کی یاد بھری بارشوں سے ڈرتے ہُوئے

کچھ ایسے دوست نہیں ہیں توازن و رفتار
رہا نہ دھیان میں ڈھلوان سے اُترتے ہُوئے

کوئی چراغ جلا کر منڈیر پر رکھ دو
ہَوا اُداس نہ ہو جائے پھر گزرتے ہُوئے

ہر ایک موڑ پہ اک دل پڑا ہُوا دیکھا
تمہارے شہرِ دلآویز سے گزرتے ہُوئے

کہا نہ تھا کہ وہ سورج ہے، دل نہیں، حامد
کہیں جو ڈوب رہا ہے، کہیں اُبھرتے ہُوئے

روشنی تیری تھی جس نے رنگ سے چھانا مجھے
ورنہ کب قوسِ قزح کے بس میں تھا پانا مجھے

میں تلاوت کر رہا ہوں رحلِ نسیاں پر تمہیں
تم بھی تسبیحِ فراموشی پہ دہرانا مجھے

کھولتا ہوں شب کی جب کھڑکی تو نیلے صحن میں
چاند اک رکھا ہوا ملتا ہے، روزانہ مجھے

عہدِ رفتہ کے شکستہ عکس کی تکرار ہوں
تم سمجھ بیٹھے ہو کوئی آئنہ خانہ مجھے

تیری کڑواہٹ ہوں حامد اور ترے لہجے میں ہوں
اے مِرے شیریں سخن! تو ہی نہ پہچانا مجھے

غزلیں

نہ چھت نہ دیوار تھی فقط در بنا لیے تھے
یہ ہم نے کیسے عجیب سے گھر بنا لیے تھے

اب ایک صحرا بھی ساتھ رہتا ہے اُس کے گھر میں
سبھی دریچے ہَوا کے رُخ پر بنا لیے تھے

نہ جانے کیوں آسماں بہت یاد آ رہا تھا
سو کچھ ستارے بھی سُونی چھت پر بنا لیے تھے

مگر پہل اب بھی ہم کو کرنا تھی بے رُخی میں
جواز ویسے تو اُس نے بہتر بنا لیے تھے

وہ جس ورق سے ہمیں بنانا تھی ایک کشتی
اُس اک ورق پر کئی سمندر بنا لیے تھے

وہ ایک سادہ سی شام تھی پر کسی نظر نے
اُس ایک منظر سے کتنے منظر بنا لیے تھے

وہ کہہ رہے تھے کہ عشق تقلید چاہتا ہے
سو ہم نے بھی سارے اشک، پتھر بنا لیے تھے

حامد یزدانی

یہ لہر کہ ساگر سے نکلتی ہی نہیں ہے
دُنیا مرے اندر سے نکلتی ہی نہیں ہے

اِک رقصِ سفر پاؤں ٹھہرنے نہیں دیتا
اِک دُھن کہ مرے سر سے نکلتی ہی نہیں ہے

کچھ نیلی کشش چین سے رہنے نہیں دیتی
اور کچھ یہ ہَوا پَر سے نکلتی ہی نہیں ہے

دِن ڈھلتے ہی آنکھیں سی نکل آتی ہیں ہر سُو
دیوار کوئی در سے نکلتی نہیں ہے

پھر زندگی دہلیز پہ بیٹھی ہی نہ رہ جائے
یہ سوچ کے وہ گھر سے نکلتی ہی نہیں ہے

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دورافتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاولپور، ممبر پبلک سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب "شاہ داستان" تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانح عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

نواب صادق قریشی بڑی قدآور شخصیت تھے۔ خوبصورت بھی تھے لیکن ایک روگ انہوں نے بچپن سے پال رکھا تھا، بڑا علاج کرایا لیکن افاقہ نہ ہوا۔ ان کا نروس سسٹم کسی عجیب سی بیماری سے کمزور پڑ گیا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اچانک اضطراری کیفیت میں ان کا ہاتھ ایک جھٹکے سے اُٹھ کر ناک یا ماتھے کی طرف چلا جاتا۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے جسم سے کوئی مکھی یا مچھر اڑا رہے ہیں۔ بعض اوقات تو مضحکہ خیز صورت پیدا ہو جاتی۔ بایں ہمہ بھٹو نے دوستی نبھائی، انہیں پہلے گورنر پنجاب اور پھر وزیراعلیٰ بنا دیا۔ بھٹو

کے زوال تک وہ وزیراعلیٰ رہے۔ حکومتی مناصب کے علاوہ لاہور میں پیپسی کولا کی فیکٹری بھی انہیں دے دی۔ ہو سکتا ہے انہیں وزیراعلیٰ بنانے میں دوستی کے علاوہ چند سیاسی مصلحتیں بھی کارفرما ہوں۔ وہ کسی ایک شخص کو زیادہ دیر تک صوبے میں وزیراعلیٰ رکھنے کے قائل نہ تھے۔ غلام مصطفیٰ کھر کے تلخ تجربے نے ان کی سیاسی بصیرت کو ایک نئی حقیقت سے روشناس کرایا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ پنجاب کا "پلے بوائے" اپنے مشاغل میں ہی غرق رہے گا اور اپنے سیاسی ہاتھ پاؤں مضبوط نہیں کر سکے گا۔ کچھ عرصہ بعد اس پر اس تلخ حقیقت کا انکشاف ہوا کہ گوشت پوست سے بنا ہوا انسان اپنے آپ کو شیر پنجاب سمجھ بیٹھا ہے اور اپنے اُستاد سے ہی دو دو ہاتھ کرنے کا خواہاں ہے۔ اقتدار کے نشے میں اُس کا سبو ٹوٹ کر اُسے سرمست کر گیا ہے۔ بھٹو نے میکاوِلی ہی نہیں شیکسپیئر کا میکبتھ (Macbath) بھی پڑھ رکھا تھا۔

To be thus is nothing than

to be safely a thus.

"بادشاہ بننے کا کیا فائدہ ہے جب تک شاہی کی حفاظت نہ کی جا سکے۔"

کھر کی رعونت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ اُستاد جوش کے گھر میں ہم سب بیٹھے شوکت علی گویے کے گانے سن رہے تھے۔ اس نے مشہور پنجابی (Folk song) "جگا" کے کچھ شعر پڑھے جو بڑے پسند کیے گئے۔

کہنے لگا "ریڈیو اور ٹی وی والوں نے جگا پڑھنے پر پابندی عائد کر رکھی ہے حالانکہ جگا سنگھ ڈاکو پنجاب کا ہیرو تھا۔"

اس پر سہیل ضیا بٹ جو خیر سے اس وقت کھر کے پرستاروں اور لٹھ بردار جتھے کے ہراول دستے میں شامل تھے فٹ سے بولے "اوئے پنجاب دے ہیرو ساڈے کھر صاحب ہیں"

اس پر کھر صاحب بولے "پنجاب میں ہر دور میں ایک ہیرو رہا ہے۔"

جب ایک دن گورنر ہاؤس میں انہوں نے بھٹو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی تو سیاسی پنڈت سمجھ گئے تھے کہ "سرآمد روزگارے ایں فقیرے" بھٹو نے اسے ہیرو سے زیرو کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

حنیف رامے والا تجربہ بھی کچھ زیادہ کامیاب نہ رہا۔ وہ کھر کی طرح فرعون اور متقم مزاج تو نہ تھا لیکن اقتدار چیز ہی ایسی ہے جس کا نشہ دل اور دماغ دونوں کو متاثر کرتا ہے۔ جب اس نے بھٹو صاحب کے ساتھ آکسونین انگلش بولنے کی کوشش کی تو وہ سمجھ گئے بابو مینار پاکستان پر کھڑا اسلام آباد کی طرف جھانکنے کی کوشش کر

رہا ہے۔
اس تناظر میں صادق قریشی کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا۔ جو شخص سورج ڈوبتے ہی طلوع ہو جاتا ہو، شراب و شباب کا رسیا ہو، جس کی دوڑ پنجاب کلب اور سورج صاحب کی خوشنودی تک محدود ہو وہ لمبے چوڑے سیاسی بکھیڑوں میں نہیں پڑتا۔
نواب صاحب سے میری طویل ملاقاتیں رہیں۔ ویک اینڈ پر ہم کھانا ایک ساتھ کھاتے ۔ ملتان آنے سے پہلے ہماری ملاقات نہ ہوئی تھی۔ ملتان آ کر بھی شاید زیادہ نہ مل پاتے کیونکہ وہ گوشہ نشین ہو چکے تھے۔ طویل علالت نے بھی اُنہیں دل برداشتہ کر رکھا تھا۔ ایک دن احمد محمود دو نوجوانوں کو لے کر میرے پاس آیا۔ ایک تو اُس کا بہنوئی جہانگیر ترین تھا اور دوسرا نواب صاحب کا بیٹا ریاض اس کے ہمراہ تھا۔ ہر دو کو میری مدد درکار تھی۔ جہانگیر ترین کو اس کے باپ اللہ نواز خان ترین نے ناراض ہو کر گھر سے نکال دیا تھا اور لودھراں میں جو ماڈل فارم تھا اس پر بھی قبضہ کر لیا۔ اللہ نواز خان ترین کو میں کوئٹہ سے جانتا تھا۔ جب میں اے سی مستونگ تھا تو وہ ڈی آئی جی کوئٹہ قلات ڈویژن تھا۔ اس سے کوئٹہ میں اکثر ملاقات ہو جاتی۔ ان دنوں جہانگیر ترین نیلی نیکر پہن کر ریزی ڈینسی روڈ پر سائیکل چلایا کرتا تھا۔ نواب صادق قریشی نے تنگ آ کر لاہور پیپسی کا پلانٹ بیچ دیا۔ خریداروں میں جہانگیر کے علاوہ احمد محمود اور ہمایوں اختر تھے۔ اس کے والد صاحب کو اس بات کا غصہ تھا کہ بزنس میں رشتہ داروں کو کیوں شریک کیا ہے۔ جب سے وہ نوکری سے نکالے گئے تھے انہوں نے اچھا خاصا کاروبار شروع کر رکھا تھا۔ ملتان میں پیپسی کا کارخانہ بھی انہی کی ملکیت تھا۔ میں نے اللہ نواز خان کو سمجھا کر اور ہلکا سا ڈرا کر اس کی زمینیں واگزار کرائیں ۔ ریاض قریشی سیاست میں آنا چاہتا تھا۔ اپنے کزن شاہ محمود قریشی کی ترقی اور سرعت رفتار دیکھ کر اس کے دل میں بھی سیاسی اُڑان کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ ضلع کونسل کے الیکشن قریب آ رہے تھے اور وہ ممبری کو بطور پہلی سیڑھی استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بھائیوں کو سیاست سے دلچسپی نہ تھی۔ عاشق اور مقبول لاہور میں رہتے تھے۔ نواب صاحب نے اپنی زندگی میں ہی جائیداد کا بٹوارہ کر دیا تھا۔ لاہور میں سکاچ کارنر والی کوٹھی عاشق کو دے دی اور شادمان میں چار کنال کا گھر مقبول کے نام کر دیا۔ ریاض کو ملتان کا وائٹ ہاؤس ملا۔ اس نے اپنے والد کے سیاسی عروج کا زمانہ دیکھ رکھا تھا۔ ملتان میں

رہائش رکھنے کا جواز بھی محض سیاست ہی ہو سکتا تھا۔ کھر کا ہم زلف تھا۔ شاکر اللہ درانی کی بیٹی زرینہ اس کے عقد میں تھی۔ ریاض تو سیدھا سادا سا نوجوان تھا زرینہ خوش شکل، ذی فہم، سمارٹ اور سوشل خاتون تھی۔ گو ان کے چار بچے تھے لیکن بالکل لڑکی لگتی۔ عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ نواب صاحب اس سے بڑے متاثر تھے۔ کہتے آج ہائی سوسائٹی میں ریاض کی جو قدر و منزلت ہے وہ سب زرینہ کی وجہ سے ہے۔ یہی اس کو چلا رہی ہے اسی کی وجہ سے سب بھرم قائم ہے۔ She is more than his better half. Infact he is not even half of her. (زرینہ نصف بہتر سے بھی بہتر ہے۔ درحقیقت خاوند بیوی کی شخصیت کا پرتو ہے)۔

گو وہ یہ باتیں مزاحیہ انداز میں کرتے لیکن کرب کی جو لکیریں ان کے چہرے پر ابھرتیں وہ صاف دیکھی جا سکتی تھیں۔ زرینہ نے ابتدائی تعلیم انگلینڈ میں حاصل کی تھی۔ وہ فر فر انگریزی دلکش انداز میں بولتی۔ خاوند صاحب کی انگلش I mean & My mean to say پر ختم ہو جاتی۔ جن لوگوں نے زرینہ اور اس کی چھوٹی بہن عدیلہ کو دیکھا ہے وہ حیران ہوتے ہیں کہ شیر پنجاب اور خادم پنجاب کو تہمینہ میں کیا نظر آیا ہے۔ اسی لئے داناؤں کا قول ہے کہ Beauty lies in the eyes of the beholder. یہ الگ بات ہے کہ کسی کو ضعفِ بصارت کا عارضہ ہو۔

زرینہ اور ریاض اکثر ہمارے ہاں آ جاتے۔ وہ ملتان شہر میں برقعہ پہنتی۔ قدرت نے حسن کے علاوہ اسے Gift of the Gab دیا ہوا تھا۔ ہنسا ہنسا کر دہرا کر دیتی خاص طور پر مخدوم حامد رضا گیلانی اور سجاد قریشی کی نقل خوب اُتارتی۔

ویک اینڈ پر کھانے کے بعد ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ نواب صاحب ماضی کی راکھ کریدتے۔ ان کے دل میں بھٹو (مرحوم) کا بڑا احترام تھا وہ اسے اپنے وقت کا ایشیا کا سب سے بڑا لیڈر مانتے تھے۔ اکثر واقعات سناتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتے۔ بھٹو کی پھانسی کے بعد مشہور ہو گیا تھا کہ نواب صاحب کی بیگم نے اپنی مہمان نصرت اور بے نظیر کا ہیروں کا ڈبہ چرا لیا تھا۔ ان الزامات کو یکسر مسترد کرتے ہوئے کہتے، اس سے زیادہ بھونڈا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ ہیروں کے ڈبے اور زیورات لوگ لاکروں میں رکھتے ہیں بغل میں دبا کر نہیں پھرتے۔ ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمیں کیا ضرورت پڑی تھی کہ اس قسم کی

حرکت کرتے۔
بھٹو کی صلاحیتوں کا ذکر چھڑتا تو کہتے۔ ایک فعال ایڈمنسٹریشن اور ظلم و زیادتی میں تھوڑا بہت رشتہ ضرور ہوتا ہے۔ مرد ناداں کلام نرم و نازک نہیں سمجھتا۔ علامہ نے درست ہی کہا تھا کہ عصا کے بغیر کلیمی کار بے بنیاد ہے۔ اس کے ڈر اور خوف کا یہ عالم تھا کہ ہر وزیر اور اہلکار کو خدشہ رہتا کہ کوئی بات اُس سے چھپی نہیں رہ سکتی۔ اگر دیواروں کے کان ہوتے ہیں تو یوں گمان ہوتا جیسے وہ بھی اس کی جاسوس ہیں۔ ایک مرتبہ تو مجھ پر بھی ایسی وحشت طاری ہوئی جسے الفاظ بیان نہیں کر سکتے۔ ہوا یوں کہ بھٹو صاحب لاہور دورے پر آئے ہوئے تھے، میں وزیراعلیٰ تھا۔ سرکاری امور نبٹانے کے بعد مجھے ایک طرف لے گئے۔ کہنے لگے "جاوید اکرم تالپی تمہارا سیکرٹری ہے۔ اس کے ساتھ شراب پینا چھوڑ دو۔ اب تم وزیراعلیٰ بن گئے ہو۔ یہ لوگ اس کو Exploit کرتے ہیں۔
بہت کم لوگوں کو علم تھا کہ وہ میرے ساتھ کبھی کبھی شغل شب کرتا ہے۔ میں نے وعدہ کیا کہ جب تک میں وزیراعلیٰ ہوں اس کو مناسب فاصلے پر رکھوں گا۔ وہ ایک لمحے کے لئے رُکے پانی کا ایک گھونٹ لیا اور پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے
Shah Sahib then came a bolt from the blue بڑا عجیب اتفاق ہوا۔ میں ان کی نصیحت کو حرز جاں بنا کر پنجاب کلب پہنچا اور بارٹینڈر کو وسکی کا پیگ بنانے کے لئے کہا۔ میں ابھی جام ہونٹوں تک بھی نہ لے پایا تھا کہ دو ممبر آ گئے۔ انہوں نے بھی ہاتھوں میں گلاس پکڑے ہوئے تھے۔
کہنے لگے "نواب صاحب! مبارک، مبارک!"
"کس چیز کی؟" میں نے پوچھا۔
بولے "سنا ہے آپ کے بیٹے ریاض قریشی کی منگنی بے نظیر سے طے پا گئی ہے۔"
یہ سننا تھا کہ جام میرے ہاتھوں سے گر کر زمین پر جا پڑا۔ زمین گھومتی ہوئی نظر آئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو مجھے سرزنش ہوئی تھی۔ میں کار میں بیٹھ کر سیدھا گورنر ہاؤس پہنچا ان دنوں بھٹو صاحب وہاں رہائش رکھتے تھے۔ جب میں نے اطلاع بھیجی تو وہ بڑے حیران ہوئے۔ اس وقت وہ بیڈروم میں چلے گئے تھے مجھے وہیں بلوا لیا۔
کہنے لگے "صادق! خیریت تو ہے۔ بڑے گھبرائے ہوئے لگتے ہو۔"
عرض کیا "سر! بات ہی کچھ ایسی ہے۔ آج جب میں یہاں سے فارغ ہو کر پنجاب کلب پہنچا تو چند ممبروں نے میرے بیٹے ریاض اور بے نظیر کی منگنی کی بات کی ہے۔

مجھے علم ہے کہ آپ کی انٹیلی جنس ایسی ہے کہ صبح تک یہ خبر آپ تک پہنچ جاتی تھی۔ پتہ نہیں کس رنگ میں پہنچتی، سو میں نے مناسب سمجھا کہ خود آ کر اپنی صفائی پیش کروں۔''

بھٹو صاحب نے میرے گھبرائے ہوئے چہرے اور ماتھے پر اُمڈتے ہوئے پسینے کا بنظر غائر جائزہ لیا اور پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے ''صادق! لوگ تو پیغمبروں کی اولاد کے متعلق بھی باتیں کرتے رہے ہیں۔ میں تو ایک انسان ہوں۔ گھبراؤ مت -Go & Relax''

میں واپس کلب آیا اور بار ٹینڈر کو کہا ''پٹیالہ!''

نواب بھٹو صاحب کی حس مزاح کے بھی قائل تھے - اس سلسلے میں دو واقعات سنائے۔

کہنے لگے ''اتفاق سے عید الفطر جمعہ کے روز آ گئی - مولانا کوثر نیازی گھبرائے گھبرائے ان کے پاس پہنچے اور درخواست کی کہ عید کو ایک روز کے لئے مؤخر کر دیا جائے کیونکہ متقیان دین کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ایسی صورت میں وہ سال سربراہ مملکت پر بھاری ہوتا ہے۔ بھٹو صاحب بھی اسی تشویش ناک لہجے میں بولے ''مولانا! میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔ سربراہ مملکت چوہدری فضل الٰہی خاصا بوڑھا ہو چکا ہے۔'' اس بات سے انہوں نے بڑا لطیف نکتہ پیدا کیا تھا۔ وہ سربراہ حکومت تھا۔ ہیڈ آف دی اسٹیٹ چوہدری فضل الٰہی تھا۔

اسی طرح چوہدری فضل الٰہی کا قصہ سناتے ہوئے کہنے لگے - وہ ہر سال آسٹریا میڈیکل چیک اپ کے لئے جاتا تھا۔ بھٹو صاحب کو تشویش لاحق ہوئی کہ وہ وہاں کیا کرتا ہے - میری ڈیوٹی لگی - میں نے پاکستان کے سفیر سے رابطہ کیا۔ اس نے آسٹریا میں ایک پرائیویٹ ڈیٹکٹو (جاسوس) کی خدمات حاصل کیں۔ اس جاسوس نے پندرہ دن بعد بڑی دلچسپ رپورٹ بھیجی۔ اس نے لکھا کہ چوہدری صاحب Sex Therapy کرانے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ایک حاملہ بھیڑ کا پیٹ چیر کر مردہ بچہ نکالتے ہیں۔ اس کے خون میں مختلف قسم کے محلول ملا کر ٹیکے بنتے ہیں جن کو سات یوم تک لگوانے سے آدمی چاہے کتنا ہی بوڑھا کیوں نہ ہو سارا سال چست رہتا ہے۔

بھٹو صاحب رپورٹ پڑھ کر بڑے ہنسے۔ کہنے لگے ''اچھا تو وہاں اس لئے جاتا ہے یہ بوڑھا شیطان۔''

نواب محمد احمد خان کے قتل کا قصہ چھڑا تو

کہنے لگے "میں نہیں سمجھتا کہ بھٹو جیسا زیرک شخص صریحاً ایسا حکم دے سکتا تھا۔ آپ نے وہ مشہور ناول Murder in the Cathederal تو ضرور پڑھا ہوگا۔ اس پر بنی ایک فلم بھی بن چکی ہے۔ بادشاہ ہیڈ پادری کی بے جا تنقید سے نالاں تھا۔ ایک دن اس نے بھرے دربار میں کہہ دیا۔ ہے جو کوئی مجھے اس ضدی شخص سے نجات دلوائے؟ دربار میں بیٹھے ہوئے تین شخص اُٹھے اور گرجے میں جا کر اسے قتل کر دیا۔ اس پر پورے ملک میں غم و غصے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ جگہ جگہ مظاہرے ہونے لگے۔ بادشاہ نے کہا "He never mean it" اسی طرح ہو سکتا ہے احمد رضا قصوری کی تنقید سے زچ ہو کر انہوں نے کہا ہو Fix him up یہ لفظ وہ اکثر مخالفین کے لئے استعمال کرتے تھے۔ شاہ سے بھی زیادہ وفادار مسعود محمود نے اس کو نمبر ٹانکنے کا ذریعہ سمجھ لیا ہو کیونکہ وہ نہایت ظالم، بے صبر اور کمینہ انسان تھا۔ پولیس سروس میں اسے نامی مسعود کہا جاتا تھا۔ ایک دفعہ اس کے کولیگ سرفراز حسین نے اپنی نو بیاہتا بیوی کو ولیمے والی رات محض اس لئے طلاق دے دی تھی کہ اس نے بیگم کو مسعود کے ساتھ ہنس کر بات کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ساری رات وہ تفتیش کرتا رہا۔ بیوی نے رو رو کر اپنی صفائی پیش کی۔ قسمیں کھائیں کہ وہ ان کا فیملی فرینڈ ہے۔ اس پر بھی شکی پولیس افسر کی تسلی نہ ہوئی۔ وہ صرف ایک بات ہی دہرائے جا رہا تھا No. He is your friend صبح تفتیش طلاق پر منتج ہوئی۔ ایسے شخص سے کوئی بعید نہیں کہ بھٹو کو خوش کرنے کے لئے وہ ایسی حرکت کر بیٹھا ہو۔ ظالم اندر سے بزدل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اصغر خان نے دھمکی دی کہ ہم انہیں کوہالہ کے پل پر پھانسی دیں گے تو اسے نروس بریک ڈاؤن ہو گیا اور اس کی ایک مونچھ خزاں رسیدہ پتے کی طرح اُڑتی ہوئی زمین پر جا گری۔ "مر تو دونوں گئے ہیں۔" نواب صاحب آبدیدہ ہو گئے۔ "ایک امر ہو گیا۔ اس کا مزار مرجع خلائق ہے اور دوسرا گمنامی کی موت مرا بھی تو اسے وطن کی مٹی نصیب نہ ہوئی۔"

عرض کیا "اسی لئے اسے جوڈیشل مرڈر کہا جاتا ہے۔"

بولے "ضیاالحق نے بھٹو کو فارغ کرنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ اس کو یقین ہو چلا تھا کہ Either it is his neck or Bhuttos neck اگر مولوی مشتاق جیسا کینہ طوز، قصاب صفت شخص نہ ہوتا تو بھی بھٹو کا جانا ٹھہر گیا تھا۔ اس کا ملٹری ٹرائیل ہوتا اور نتیجہ وہی نکلتا۔"

"بھٹو کے زوال میں آپ لوگوں کو بھی مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ اگر وسیع پیمانے پر دھاندلی نہ ہوتی تو تحریک کی نوبت نہ آتی۔ ہر وزیر اعلیٰ یہ تہیہ کر لے کہ اس نے بلا مقابلہ منتخب ہونا ہے تو پھر پارٹی کے دیگر ارکان بھی ہر حرکت کر گزرتے ہیں۔"

بولے "یہ درست ہے کہ ہم سے غلطیاں ہوئیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عوامی مقبولیت بھی بھٹو کی تھی اور جیتنا بھی اس کی پارٹی کو تھا۔ ہم امریکیوں کی گیم پلان نہ سمجھ سکے۔ سو میل کی رفتار سے چلتی ہوئی ٹرین کا ہیمبری کسنجر نے جو ذکر کیا تھا، اس کے نیچے کسی کو تو آنا ہی تھا۔"

"بھٹو صاحب پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ پاکستان توڑنے میں ان کا ہاتھ تھا۔ اِدھر ہم اُدھر تم کا نعرہ انہوں نے لگایا، اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پولینڈ کی قرارداد انہوں نے پھاڑ دی۔ دراصل وہ سمجھتے تھے کہ مشرقی پاکستان کی موجودگی میں اُن کا حکومت کرنے کا کوئی چانس نہیں تھا۔"

"اب اسے قوم کی سادہ لوحی ہی کہا جا سکتا ہے۔" انہوں نے تاسف بھری نظروں سے میری طرف دیکھا "آپ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ اگر بھٹو نہ ہوتا تو کیا پاکستان بچ جاتا۔ دولخت نہ ہوتا۔ سب کچھ سکرپٹ کے مطابق ہو رہا تھا۔ ہندوستان کو سپر پاور کی اشیر باد حاصل تھی اسی لئے اندرا گاندھی نے حملے سے پہلے یورپ اور امریکہ کا دورہ کیا تھا۔ پولینڈ چھوڑ اگر سارا مشرقی یورپ بھی قرارداد پیش کرتا تو ہندوستان اور مکتی باہنی اسے منظور نہ کرتے۔ حملہ تو ہندوستان نے کیا تھا لیکن بغاوت سارے مشرقی حصے نے کی تھی۔ بالفرض ہندوستان حملہ نہ کرتا تو بھی کتنے دن المیہ کو ٹالا جا سکتا تھا۔ ملٹری رول نے انہیں مکمل طور پر Alienate کر دیا تھا۔ باقی رہا سوال اِدھر ہم اُدھر تم کا۔ تو مجیب الرحمٰن کے چھ نکات منظور ہونے کی صورت میں مرکز کے پاس کیا بچتا۔ یہ چھ نکات صرف مشرقی پاکستان پر ہی نہیں سندھ، بلوچستان، سرحد اور پنجاب پر بھی لاگو ہوتے۔"

"تاریخ بھٹو کو کن الفاظ میں یاد کرے گی؟" میں نے آخری سوال پوچھ ڈالا۔

"وقتی طور پر تو تاریخ حکمرانوں کے ایما پر لکھی جاتی ہے لیکن مستقبل کا مورخ اس کے جائز مقام کا تعین کرے گا۔ وہ جینئس تھا، دل میں قوم کا دکھ درد رکھتا تھا۔ باوجود زمیندار ہونے کے عوام کا مونس و غم خوار تھا۔ اس کا ہاتھ اگر ان کی نبض پر ہوتا تو نگاہیں بین الاقوامی امور پر گڑی ہوتیں۔ وہ بڑی جلدی میں تھا۔ اس کے خاندان کا

Average lifespan زیادہ نہیں تھا۔ اس بات کا اسے ادراک تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ حیات طبعی میں ہی قوم کے لئے ایسا کام کر جائے جس سے پاکستان ترقی کی منازل طے کرے اور اس کا نام بھی امر ہوجائے۔ وہ نیک انسان تھا لیکن فرشتہ نہیں تھا۔ اس میں بھی بشری کمزوریاں تھیں ۔ ویسے بھی پیغمبروں کو چھوڑ کر جتنے بھی دنیا میں جینیس انسان گزرے ہیں ان میں Pervertion by definition کا تھوڑا بہت عنصر ہوتا ہے۔"

"ضیاالحق نے پھانسی دے کر قوم پر ظلم کیا؟"

بولے "دکھ کی بات یہ نہیں ہے کہ ضیا الحق نے اسے مروا ڈالا۔ اگر آپ ہندوستان کی تاریخ دیکھیں تو یہ کوئی انوکھی یا انہونی بات نہیں ہے۔ یہاں تخت کے حصول کے لئے بھائی نے بھائی کا گلا کاٹا ہے۔ بیٹے نے باپ کو قید تنہائی میں رکھا ہے۔ باپ نے بیٹے بیٹیوں کو پابند سلاسل کیا ہے۔ دکھ صرف اس بات کا ہے کہ جیل میں اس سے ناروا سلوک کیا گیا۔ گرمیوں کے شدید موسم میں بھی اسے 8×10 کی کال کوٹھڑی میں رکھا گیا۔ علاج معالجے کی سہولتوں سے محروم کر دیا گیا۔ رات کو بجلی کا بلب روشن رکھا جاتا تا کہ اسے نیند نہ آئے۔ فردوسی ویسے ہی تو نہیں کہہ گیا تھا ۔ شود عاقبت بچہ زاغ زاغ۔"

"ایک ذاتی سوال ۔ آپ نے کمپنی کا کارخانہ کیوں بیچ ڈالا؟"

ایک زہر خند مسکراہٹ ان کے چہرے پر اُبھری "اپنے آپ کو برہنہ کرنا کچھ اچھا نہیں لگتا لیکن آپ سے کیا چھپانا ہے۔ میری صحت جواب دے گئی ہے۔ اولاد نالائق اور نااہل ہے۔ ان میں کچھ دم خم ہوتا تو آج اپنے پھوپھی زاد شاہ محمود کی جگہ وزیر ہوتے۔ ہر کسی نے کارخانے کو لوٹنا شروع کر دیا۔ شام کو جس کے ہاتھ جتنی کیش آتی وہ لے کر چلتا بنتا اور تو اور میرے داماد زاہد حامد نے بھی اس کارخیر میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اگر بروقت نہ بیچتا تو کارخانے کے ساتھ خاندانی عزت بھی نیلام ہوجاتی۔"

نواب صاحب باوجود کوشش کے خاندانی وقار نہ بچا سکے۔ ایک دن ان کے بیٹے مقبول نے انہیں شادمان والی کوٹھی سے نکال دیا۔ راتوں رات اس نے ان کا سارا سامان سڑک پر پھینکوا دیا۔ اپنی زندگی میں جائیداد بیٹوں کے نام کرنے کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ وہ بیماری کی حالت میں ڈیفنس میں ایک کرائے کے مکان میں رہے اور بالآخر کئی داغ سینے پر سجائے چل بسے۔

[جاری ہے۔]

پاء جی

محمد کلیم

زندگی بڑی خوب صورت ہے اور اس کے کئی رنگ ہیں۔ انھی رنگوں میں سب سے زیادہ رنگ انسانوں کے ہیں۔ پاء جی کا بھی اپنا رنگ تھا۔ کبھی گہرا سیاہ، کبھی گہرا گلابی اور کبھی بالکل سفید۔ پاء جی سے ہماری ملاقات سرکاری تربیت کے دوران ہوئی اور وہ ہمارے روم میٹ تھے۔ تربیت کے دوران ہر کمرہ میں دو تربیتی افسروں کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ اس لیے ایک ساتھی آپ کے ساتھ کمرہ میں ہوتا ہے۔ دورانِ تربیت آپ کا سب سے زیادہ واسطہ بھی اپنے روم میٹ کے ساتھ پڑتا ہے اس لیے تربیت کے دوران آپ کی زندگی روم میٹ کے گرد گھومتی ہے۔ پاء جی کا تعلق جی ٹی روڈ سے تھا اس لیے وہ جٹ طیارہ پر چڑھ کر تربیت گاہ تک پہنچے تھے۔ جب ہم نے پہلی بار پاء جی کو دیکھا تو وہ کمرے میں اپنا سامان رکھ چکے تھے اور اپنے پچکے ہوئے چہرے کے ساتھ گہری دبی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ہم نے جب غور سے پاء جی کو دیکھا تو ہمیں محسوس ہوا پاء جی کے جسم میں کچھ گڑ بڑ ہے جیسے کبھی کسی گاڑی کو شدید حادثہ ہو جائے تو اس میں خاص قسم کا ٹیڑھا پن آ جائے جو رنگ ڈینٹ کرانے سے بھی نہ جائے۔ کچھ اس قسم کا خم پاء جی میں بھی تھا جس کو ہو سکتا ہے (میرا قیاس ہے) پاء جی کے ماں باپ نے کافی کوشش کے بعد اس کو کچھ سیدھا کیا ہوگا ورنہ وہ چلتے ہوئے کافی سے زیادہ جھولتے۔ پہلی رات کو ہی پاء جی کہنے لگے کلیم پاء ہم دروازے کو کنڈی لگا کر سوئیں گے تو ہماری آنکھ کھلی کی کھلی ہی رہ گئی یعنی کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ پاء جی کے شوق نوابی ہیں یا وہ کچھ اور چاہتے ہیں۔ شکل سے تو شریف آدمی معلوم ہوتے تھے اور ہمیں بھی ایسا کوئی شوق نہیں تھا۔ ہم نے سوچا اگر ایسا کچھ ہوا تو قابو کر

لیں گے۔ بہر حال ہم نے کنڈی چڑھائی اور اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئے۔ کچھ دیر بعد کمرہ پاء جی کے خراٹوں اور گالیوں سے گونج رہا تھا۔ تیری بہن کا، تیری ماں کا، نجانے کیا اول فول بک رہے تھے اور باقاعدہ بستر پر اچھل کر لڑ رہے تھے۔ خراٹے بھی جاری تھے ایسا لگتا تھا کہ خواب کی حالت میں ہیں۔ ہم سمجھ گئے کہ کنڈی چڑھانے کی وجہ کیا تھی۔ اب ہم ساری رات ان کی گالیاں سنتے اور آنکھیں بند کیے ہوئے سونے کا مکر کرتے رہے حالاں کہ اتنی آواز ہوتی کہ نیند تو دور کی بات آنکھیں بھی بند ہونا مشکل تھا۔

ایک رات پاء جی نیند میں چلتے چلتے میرے بستر پر آ کر سو گئے۔ ہم نے اپنے ساتھ جسم کی حرارت محسوس کی تو معلوم ہوا پاء جی اپنا بستر چھوڑ کر ہمارے ساتھ سوئے ہوئے ہیں۔ ہم نے کروٹ بدلی اور کس کر ان کو گلے لگایا تو ان کی نیند کھل گئی تو فرمانے لگے ''کلیم پاء تسی'' میں نے جواب دیا ''نہ پاء جی تسی'' تو وہ شرمندہ ہو کر اپنے بستر پر تشریف لے گئے۔ ہمیں اس دن معلوم ہوا کہ پاء جی نہ صرف نیند میں گالیاں بکتے ہیں، لڑتے ہیں بلکہ چلتے پھرتے ہیں اور انھیں اپنی اس عادت (بیماری بھی کہہ سکتے ہیں) کا بخوبی علم ہے اس لیے پہلے دن سے دروازے کی کنڈی چڑھائی تھی تاکہ نیند میں چلتے چلتے کمرے سے باہر نہ نکل جائیں۔

ملتان میں رہنے والوں پر اپنے دوستوں کو دو چیزیں کھلانا لازم ہیں۔ نمبر 1 سوہن حلوہ، نمبر 2 آم۔ ہر شخص سمجھتا ہے کہ ملتان میں رہنے والا ہر شخص آموں کے باغ کا مالک ہے اور ہر سال کئی ٹن آموں کی پیداوار ہوتی ہے اس لیے اس کو اپنے دوستوں کو سوغات کھلانی پڑتی ہے۔ ہم کو بھی دوران تربیت ٹھیک ڈالی گئی جو ملتانی ہونے کے ناطے خوشی خوشی قبول کی۔ ہم آم کی پیٹیاں لے کر پہنچ گئے اور سوچا دوپہر کے کھانے کے بعد ہم سب کا منہ میٹھا کرائیں گے۔ یہی سوچ کر اپنے بستر پر آ کر آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی تیاری کرنے لگے۔ ابھی ذرا سے اونگھ آئی تھی کہ کمرے میں کھٹ پٹ ہونے لگی۔ آنکھیں کھولیں تو کیا دیکھتے ہیں پاء

جی اپنے تمام جٹ براوران کے ساتھ آم کھا رہے اور ہنستے جا رہے ہیں۔ ہم نے اتنا کہا پاء جی کیا آپ کو آم نہیں ملتے تھے؟ اور کروٹ بدل کر سو گئے لیکن چار جٹ پوری آموں کی پیٹی چٹ کر گئے اور اپنا اصل دکھا گئے۔

پاء جی اپنا زیادہ تر وقت اپنے جٹ براوران کے ساتھ گزارتے تھے اور رات گئے کمرہ میں سونے کے لیے تشریف لاتے تھے۔ ان کا زیادہ وقت پتے کھیلتے، جگتیں مارتے اور کچا سا منہ بناتے ہوئے گزرتا تھا۔ پاء جی جب جگت مارتے تو ان کی جگت سن کر نہیں بلکہ منہ کے کچا پن کو دیکھ کر ہنسی چھوٹ جاتی اور لوگ ہنستے جاتے اور کہتے ''تم بھی ناں''۔

پاء جی نے دوران تربیت کبھی پریشانی نہیں لی۔ ہمیشہ ہنستے مسکراتے رہتے اور کچے منہ کو لیے اِدھر اُدھر پھرتے رہتے۔ ان کی زبان پر اکثر یہ فقرہ رہتا تھا، ''ڈنگیں لتیں تے پولیس مقابلے'' ''ٹیڑھی ٹانگیں اور پولیس مقابلے''۔ ہم نے کئی بار ان سے اس فقرہ کی اصلیت اور تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ خاموش رہتے لیکن جب ہماری نظریں ان کی ٹیڑھی ٹانگوں کی طرف جاتیں تو ہمیں لگتا وہ اپنے بارے میں یہ فقرہ دہراتے رہتے ہیں۔

تربیت کے بعد بھی ہمارا ان سے یارانہ ہے۔ وہ اکثر کوئی مشورہ لینا ہو تو مجھ ناچیز سے رابطہ کرتے ہیں اور ہم بھی الٹے سیدھے مشورے دیتے رہتے ہیں۔ کچھ دن پہلے وہ امریکا سے قانون کی ڈگری لے کر آنے لگے۔ مجھ سے پوچھنے لگے واپس آئیں یا امریکہ بس جائیں؟ ہم نے کہا یہ تو آپ کی طبیعت، حالات اور مستقبل کی سوچ پر منحصر ہے۔ انھوں نے کہا ٹھیک ہے اور پھر معلوم ہوا وہ امریکا سے واپس تشریف لے آئے ہیں اور ایک ضلع کی ڈپٹی کمشنری سنبھال رکھی ہے۔ اب معلوم نہیں انھوں نے میری بات کو برا محسوس کیا یا انھوں نے خود کو پہچان کر واپسی کا راستہ لیا ہے (خدا کی خدا جانے)۔

☆☆☆☆☆

غزل

رنگ سا پھرتا ہے زیرِ آسماں ، دیکھا ہوا
روبرو اک عکس ہے ___ جانے کہاں دیکھا ہوا

کس کے ہونے کی خبر دیتے ہیں یہ دیوار و در
جانے کیوں لگتا ہے مجھ کو یہ مکاں دیکھا ہوا

اک گھروندا ہولے ہولے گھل رہا ہے آج بھی
ایک منظر ہے تہہ آبِ رواں دیکھا ہوا

میں تو پہلی بار آیا تھا تمہارے شہر میں
ناگہاں مجھ کو لگا شہرِ گماں دیکھا ہوا

اک مہک بن کر نظر اُٹھتی ہے میری، چارسُو
میں تو پہروں دیکھتا ہوں یہ جہاں دیکھا ہوا

ہر گھڑی پایا نیا دھڑکا پرانے رنگ کا
آگ ان دیکھی لگی، اُٹھا دُھواں دیکھا ہوا

دن نکلتے ہی گھروں سے چل پڑے شیشہ بکف
سُورج اُبھرا ہے کہ اک کوہِ گراں دیکھا ہوا

ماند رہ جائے گی اس شب آنسوؤں کی آب بھی
چاند پھر نکلا پسِ دیوارِ جاں دیکھا ہوا

آسماں تھا یا شکستہ چھت اندھیری قبر کی
رات بھر دیکھا کیا میں آسماں دیکھا ہوا

ساتھ چلتا ہے کنارے پر کناروں کی طرح
کیا کہوں خالد کہ ہے یہ مہرباں دیکھا ہوا

خالد احمد

غزل

کتاب سادہ رہے گی کب تک کبھی تو آغازِ باب ہو گا
جنھوں نے بستی اجاڑ ڈالی کبھی تو ان کا حساب ہو گا

وہ دن گئے جب ہر اک ستم کو ادائے محبوب کہہ کے چپ تھے
اٹھی جو اب ہم پہ اینٹ کوئی تو اس کا پتھر جواب ہو گا

سحر کی خوشیاں منانے والو! سحر کے تیور بتا رہے ہیں
ابھی تو اتنی گھٹن بڑھے گی کہ سانس لینا عذاب ہو گا

سکوتِ صحرا میں بسنے والو، ذرا رُتوں کا مزاج سمجھو
جو آج کا دن سکوں سے گزرا تو کل کا موسم خراب ہو گا

نہیں کہ یہ صرف شاعری ہے، غزل میں تاریخ بے حسی ہے
جو آج شعروں میں کہہ دیا ہے، وہ کل شریکِ نصاب ہو گا

مرتضیٰ برلاس

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سامان بہم کر، کہ نہ لوٹے کبھی خالی
یارب، کوئی مجھ بے سر و سامان کے در سے

غزل

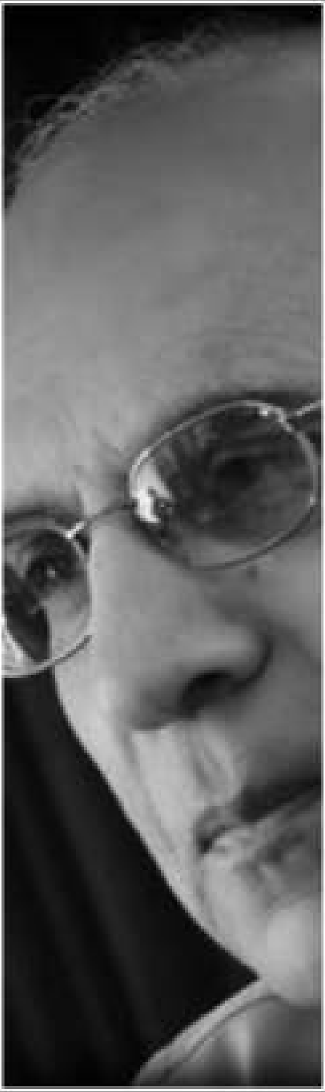

تو جسے عشق کی میزاں پہ کھرا تولتا ہے
سوچ کیوں اُس کی حمایت میں عدو بولتا ہے

کبھی جلدی کبھی تاخیر کی رِم اپنی جگہ
وقت گرہیں جو لگاتا ہے وہ خود کھولتا ہے

کسی عجلت میں اُساری ہوئی ڈھاری کی طرح
تارِ تشکیک پہ کیوں تیرا یقیں ڈولتا ہے

کس کو کھلتی ہے بہت چہرۂ انساں پہ خوشی
کون اس زمزمِ جاں میں سمِ غم گھولتا ہے

آسمانوں کے لیے میں مرا جاتا نہیں ہوں
اِس زمیں ساتھ ازل کی مری ہجولتا ہے

ایک درجے پہ گدا کی بھی انا ہوتی ہے
تجھ طرح کب کسی آگے کوئی سکولتا ہے

مطمئن ہو نہیں پاتا مرا احساسِ جمال
مرے ہر شعر پہ کہتا ہے کہیں 'جھولتا' ہے

رول دیتا ہے وہ سب زاویِ ہنر مٹی میں
اور چاہے تو کھلے عیب کو انمولتا ہے

کبھی کرتا ہے کرم صورتِ غم بھی عالی
کبھی وہ فرطِ نعم سے ہمیں پرچولتا ہے

جلیل عالی

غزل

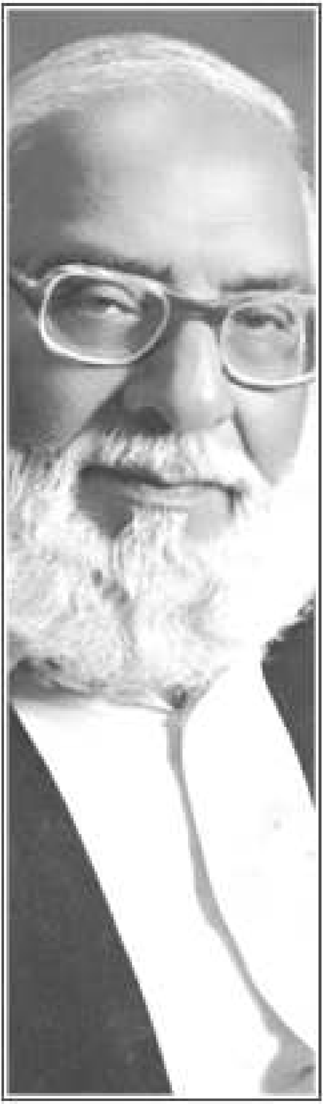

سمندر سے جو موتی رولتا ہے
وہ ہر مشکل کو سہنا جانتا ہے

کھلا ہے رازِ دل جس پر بخوبی
وہ رازِ کن فکاں پہچانتا ہے

اسے کیا آسماں کی وسعتوں سے
سراسر جو زمیں کو تاکتا ہے

قدم اٹھیں تو پوری تمکنت سے
سفر عزمِ سفر بھی مانگتا ہے

مقدر ہے فقط صاحب جنوں کا
جو دستارِ فضیلت چاہتا ہے

وہی آئینہ گر مشاق ٹھہرا
پسِ آئینہ جو بھی جھانکتا ہے

ریاض اس کی نگہ داری مبارک
جو قلبِ مضمحل کو تھامتا ہے

سید ریاض حسین زیدی

غزل

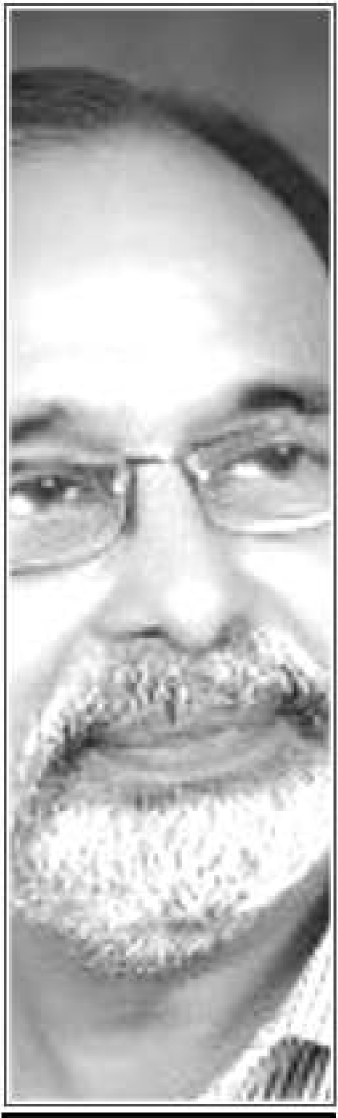

نہ اِس کی گرد کھلی اور اِس کا پانی کھلا
یہ خاکدان ، کڑی دھوپ کی زبانی کھلا

ہر اک پڑاؤ کے پہلو میں آگ جلتی رہی
سو روشنی کا بھی کردار داستانی کھلا

یہ ایک لمحہ جو ہے ہاتھ سے نکلتا ہوا
اس ایک لمحے میں ہے کتنی بیکرانی ، کھلا

پرندے دور افق تا افق دکھائی پڑے
ڈھلی جو شام تو اک رنگِ جاودانی کھلا

سمجھ رہے تھے کہ ہم پر کبھی کھلے گا نہیں
مکانِ خاک میں آ کر وہ لامکانی کھلا

نہ جانے کتنے سخن ہم گرہ میں باندھے پھرے
پھر ایک حرف کھلا اور درِ معانی کھلا

نہ شاخِ گل ہے نہ سایہ کسی شجر کا یہاں
مثالِ ریگِ رواں ، خوابِ خوش گمانی کھلا

پلٹنا چاہیں تو اطہر پلٹ بھی سکتے نہیں
بہت ہی دیر میں احساسِ رائگانی کھلا

ممتاز اطہر

غزل

میں ناچیز سی بوند ہوں تجھ میں شامل اے دریا
قطرے قطرے سے ہے تیری محفل اے دریا

اوپر اُٹھنے والے نم سے بادل ہیں تشکیل
بارش ہوتی ہے اسی باعث نازل اے دریا

کہساروں میں پگھلی برف نے جنم دیا تجھ کو
آگے قلزم بحر ہیں تیری منزل اے دریا

ہو مغرور نہ اتنا اپنی اُٹھتی لہروں پر
بارانی موسم سے ہے تو بھی کامل اے ریا

صحراؤں کی پیاس بجھانا بھول گیا کیسے
باغوں پر آتا ہے تیرا کیوں دل اے دریا

کھینچتا ہے تو اپنی جانب کشتیاں بجرے بیڑے
کم ہی دیکھا ساحر تجھ سا عامل اے دریا

ساکت جھیلیں تیرا ماخذ بھول نہ تو ان کو
بہتے پانی پر ہی سہی تیرا محل اے دریا

دیکھ کے سوکھا راوی آئے یہی خیال مجھے
سدا نہیں رہنی ہے تیری جھلمل اے دریا

سب کو اپنی اصل کی جانب لوٹ کے ہے جانا
تجھے بھی ہونا ہوگا بحر میں داخل اے دریا

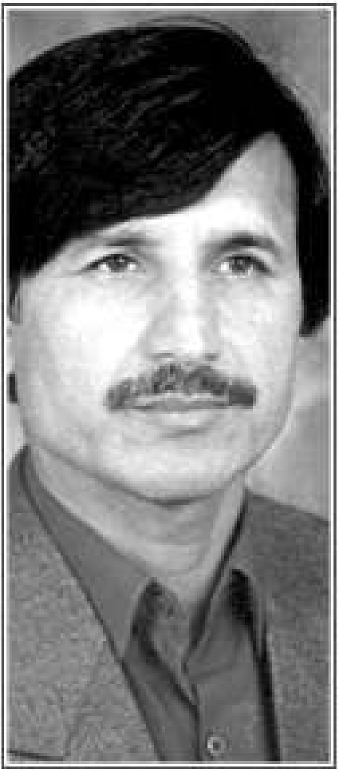

گلزار بخاری

غزل

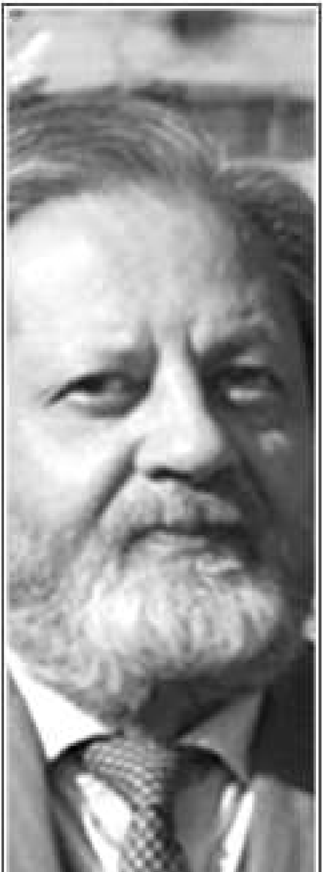

کشتیاں ڈوبتی آئی ہیں مرے ساحل پر
اَب کے ڈوبا ہے مگر شرم سے دریا خاور

کان میں آ نہ پڑے اپنی ہی آواز کہیں
ہاتھ رکھے ہیں موذن نے جبھی کانوں پر

ایسی شمع ہُوں کہ دُنیا کی ہوائیں ہر جا
اُڑتی پھرتی ہیں مرا پرچمِ تاباں لے کر

ٹہنیاں کاٹتے جاتے ہو تو یہ یاد رہے
ایک دن پیڑ کا سایہ نہ رہے گا سر پر

عمر بھر شکل نہ دیکھی تھی جنھوں نے میری
آج منہ دیکھتے ہیں میرا کفن سَرکا کر

میرا قصہ تو وہیں کا وہیں رہ جاتا ہے
لوگ اُٹھ جاتے ہیں چوپال سے اپنی کہہ کر

یہ جو پتھر نظر آتے ہیں پڑے رستے میں
یہ وہی لوگ ہیں جو دیکھتے تھے مڑ مڑ کر

آخری قسط ادا کرنی ہے اور کیسے میں
سانس کا ایک بھی سکہ نہیں باقی خاور

خاور اعجاز

غزلیں

یادوں کا کوئی بار اُٹھایا نہیں کبھی
ہم نے خیال اس کا بھلایا نہیں کبھی

رکھ لی ہے جان دے کے وفاؤں کی آبرو
اس دل لگی کو ارزاں بنایا نہیں کبھی

اس کو بھی چارہ سازیٔ جاں کی خبر نہیں
ہم نے بھی کوئی زخم دِکھایا نہیں کبھی

ہر داستان اُس کو سنائی حیات کی
اک درد کا فسانہ سنایا نہیں کبھی

اُس کے بھی راستے میں بچھائی ہے چاندنی
جس نے دیا وفا کا جلایا نہیں کبھی

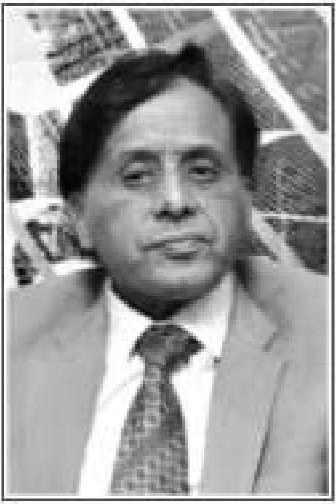

نثار ترابی

خواہشِ بام و در میں زندہ ہیں
ہم مسلسل سفر میں زندہ ہیں

حسرتوں کا ہجوم باقی ہے
خواب ہر چشمِ تر میں زندہ ہیں

جھولتی ڈالیاں بتاتی ہیں
اب بھی پنچھی شجر میں زندہ ہیں

تو نے دیکھا تو ہو گیا ہے یقیں
ہم بھی تیری نظر میں زندہ ہیں

رنگ مرتے نہیں زمانے سے
پھول سب بحر و بر میں زندہ ہیں

ایک پتھر کی مار ہیں صاحب
وہ جو شیشے کے گھر میں زندہ ہیں

زندگی ان کی زندگی تو نہیں
جو غمِ مال و زر میں زندہ ہیں

غزل

چراغ لاکھ گھسایا غلام آیا نہیں
یہ جن، کبھی کسی مشکل میں کام آیا نہیں

سڑک عبور کی، انجام سے بھی آگے کی
ہنوز پھر بھی کہیں اختتام آیا نہیں

سفر کے بعد کا ہر مرحلہ ہی مشکل تھا
سفر میں تو کوئی مشکل مقام آیا نہیں

بھرا پڑا تھا شہر منتقم مزاجوں سے
ہمیں ہی لینا کبھی انتقام آیا نہیں

پرندے پیڑوں کا مافی الضمیر جانتے ہیں
ہمیں تو دونوں سے کرنا کلام آیا نہیں

یہ زندگاں کی بھی فہرست منہ چڑا رہی ہے
ادھر ہمارا شہیدوں میں نام آیا نہیں

یہ بندوبست ہمیں خود ہی جا کے کرنا پڑا
کہیں وہ کر کے کوئی انتظام آیا نہیں

پھر اُس نے مجھ پہ محبت کا جال پھینک دیا
کسی طرح بھی میں جب زیرِ دام آیا نہیں

گزرتے وقت کو پھر کس طرح منا لیتے
ہمارے ہاتھ میں وہ بے لگام آیا نہیں

سسکتے تاروں کی سرگوشیاں بتاتی رہیں
نہا کے جھیل سے ماہِ تمام آیا نہیں

کبھی بھی چھو نہیں سکتی اُسے حرام کی موت
وہ جس کو کھانا کمانا حرام آیا نہیں

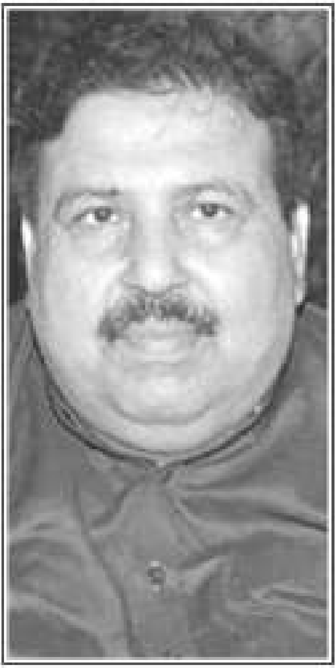

مسعود احمد

غزل

نفرتوں کا ہر نشاں مسمار ہونا چاہیے
نشۂ الفت سے دل سرشار ہونا چاہیے

میرے گھر کے راستے میں کہکشاں ہو یا نہ ہو
اس کے گھر کا راستہ ہموار ہونا چاہیے

یہ چھپانے سے کبھی چھپتا نہیں ہے باخدا
"عشق ہے تو عشق کا اظہار ہونا چاہیے"

میرے گھر تک ان کا آنا اتفاقاً ہے اگر
اتفاق ایسا تو پھر ہر بار ہونا چاہیے

آپ کی باتیں بڑی ہیں آپ ٹھہرے معتبر
آپ کو تو قافلہ سالار ہونا چاہیے

پرسشِ احوال کو ویسے بھی آ سکتے ہیں وہ
کیا ضروری ہے ہمیں بیمار ہونا چاہیے؟

دل سرائے تو نہیں مہمان جو چاہے رہے
کوئی پیمانہ کوئی معیار ہونا چاہیے

ہم بھی بکنے کے لیے تیار ہیں عرفاں مگر
شرط یہ ہے مصر کا بازار ہونا چاہیے

محمد عرفان خان

غزل

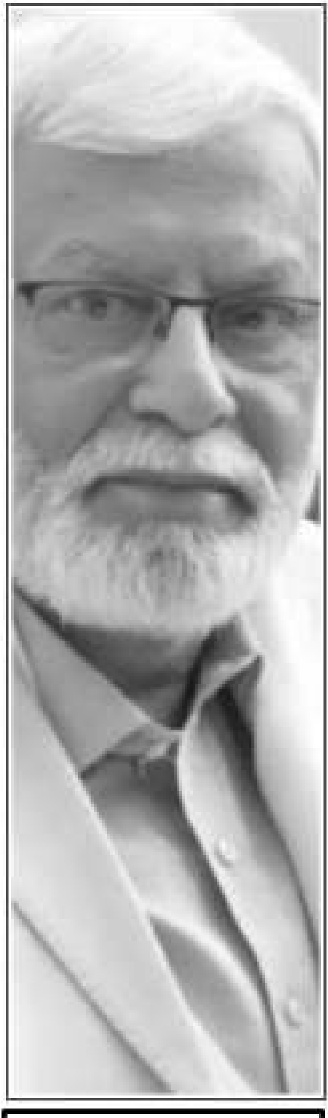

تم سے ہم کتنا پیار کرتے ہیں
جان تک بھی نثار کرتے ہیں

دن ، مہینے ، برس گزر جائیں
تیرا ہم انتظار کرتے ہیں

کھوج میں جب تری نکلتے ہیں
پھر حدیں ساری پار کرتے ہیں

تُم نے وعدہ کوئی وفا نہ کیا
پھر بھی ہم اعتبار کرتے ہیں

عشق کا سر پہ ہے جنوں طاری
پیرہن تار تار کرتے ہیں

کتنا نیّر حسین ہے یارو!
سب اُسی سے ہی پیار کرتے ہیں

نیّر سرحدی

غزل

اُنھی سے ہیں میری شبوں میں اُجالے
جو ہیں ٹوٹے کمرے میں مکڑی کے جالے

یہ مہتاب مکھڑے، یہ زلفوں کے ہالے
مہکتے اندھیرے، سُنہرے اُجالے

مجھے زندگی میں دکھاتے ہیں رستہ
ستاروں سے روشن ہیں ہاتھوں کے چھالے

سمجھ میں نہیں اس کے کچھ آ رہا اب
محبت کو دیکھے یا آنچل سنبھالے

جہاں چھوڑ کر اب چلے جا رہے ہیں
کہو اس سے بس اِک نظر ہم پہ ڈالے

ہر اک سمت میں جگنوؤں کا ہے پہرہ
کہو چاند سے اب ندی میں نہالے

محبت کے ماروں کا وہ ہے مسیحا
جو خوشبو کے زخموں کا مرہم بنالے

ہے فرعون مہنگائی کا اتنا ظالم
جو بچوں بڑوں، سب کو ہی مار ڈالے

عقیل اَب متاعِ قلم چھن گئی ہے
زبانوں پہ پہرے ہیں، ہونٹوں پہ تالے

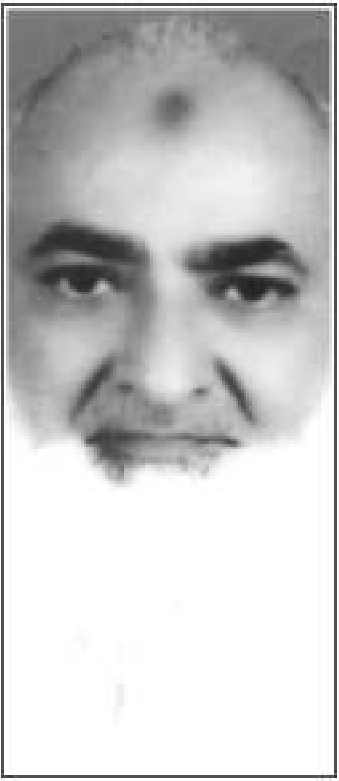

عقیل رحمانی

غزل

آب زم زم کی کچھ کمی نہ رہی
پیاس ایسی تھی جو کبھی نہ رہی

ظلم اتنا تھا، کچھ کمی نہ رہی
آنکھ روتی رہی، نمی نہ رہی

ماہ رُو کوئی بزم میں آیا
"اَب چراغوں میں روشنی نہ رہی"

پہلے اَنگ اَنگ مُسکراتا تھا
اَب تو چہرے پہ بھی ہنسی نہ رہی

حُسن بھی اب بُجھا بُجھا سا ہے
عشق میں بھی وہ شعلگی نہ رہی

پھر نیا دوست ہم بنائیں گے
تُجھ سے اب دوستی رہی نہ رہی

جی رہا تھا کچھ اس طرح اعجاز
زندگی جیسے زندگی نہ رہی

دوستی تجھ سے کیا ہوئی اجمل
اب کسی سے بھی دشمنی نہ رہی

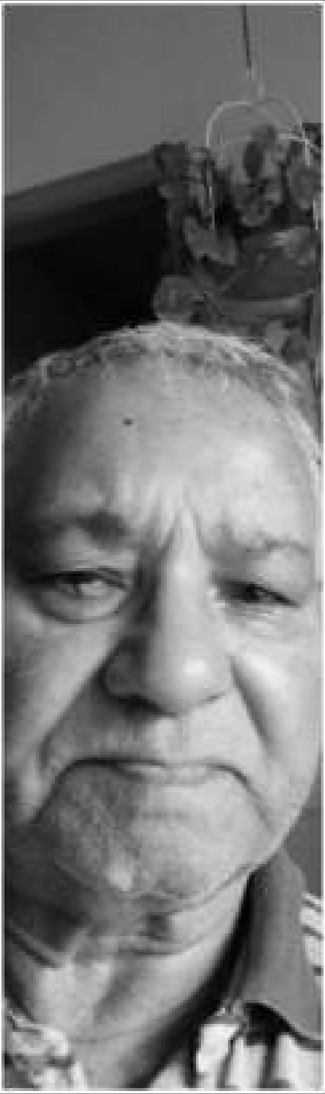

اجمل اعجاز

غزل

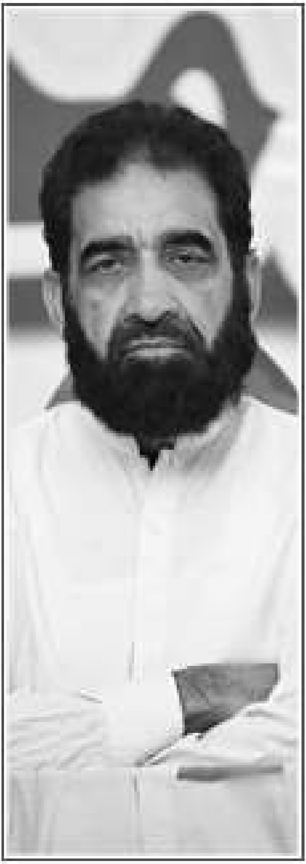

کوئی دعا سلام تو رکھتے بڑوں کے ساتھ
تم نے تو بدمزاجی میں ہر بازی ہار دی

نہ حسنِ کارکردگی نہ کارکردگی
تم نے تو یار زندگی یوں یہ گزار دی

دریا نے چشمِ موج سے دیکھا ہمیں مگر
ہم نے بپھرتی موجوں میں کشتی اتار دی

ہم بھی بچشمِ تر رہے اس در پہ سجدہ ریز
اس نے بھی بارہا ہمیں مہلت ادھار دی

اے سعد اس نے دیکھی ہماری جو بے بسی
کچھ کچھ ہماری دنیا بھی اس نے سنوار دی

سعداللہ شاہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچھ سجھائی نہیں دیتا پسِ دیوار بکا
کون سنتا ہے ترے خیرہ سروں کا رونا

غزل

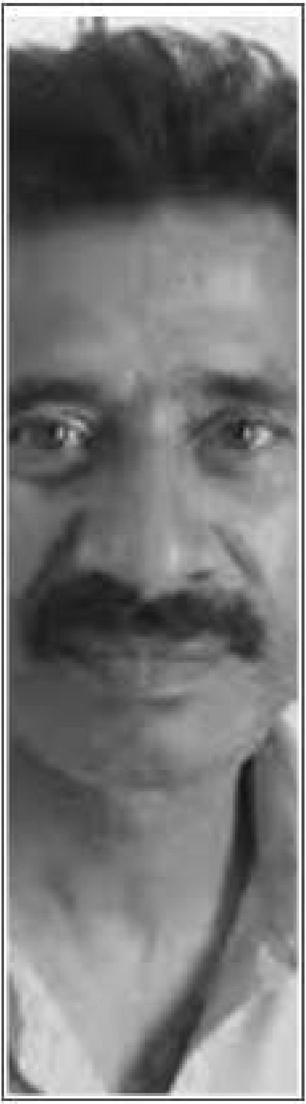

ببول بو کے چمن سے گلاب مانگتے ہیں
فلک سے اپنے لئے خود عتاب مانگتے ہیں

بتائے کون انہیں خیر و شر کی تفسیریں
بہا کے خون، خدا سے ثواب مانگتے ہیں

خدارا اونچی کرو مے کدے کی دیواریں
کہ ان کو پھاند کے زاہد شراب مانگتے ہیں

ہمارے شہر میں کشکول بٹ رہے ہیں حضور
یہاں بڑے بڑے عزت مآب مانگتے ہیں

مرے سوال پہ اٹھتے ہیں ان کے کتنے سوال
جواب دیتے نہیں ہیں جواب مانگتے ہیں

وہ جن پہ خرچ، جوانی بھی کی ضعیفی بھی
بڑے ہوئے ہیں تو مجھ سے حساب مانگتے ہیں

میں چاہتا ہوں کہ خالی نہ ان کو لوٹاؤں
مگر یہ آنکھیں نہیں میرے خواب مانگتے ہیں

رانا سعید دوشی

غزل

دل کے اک اک شوق پر قربان تھا، وہ بھی گیا
وہ بھی مجھ جیسا الگ انسان تھا، وہ بھی گیا

پتّی پتّی غنچۂ الفت بکھر جانے کے بعد
باقیات ربط میں اک مان تھا، وہ بھی گیا

جاتے جاتے لے اڑی اطراف سے خوشبو ہوا
گھر سجا لینے کا کچھ سامان تھا، وہ بھی گیا

خود سمندر میں ڈبو دیں کاغذوں کی کشتیاں
پار لگنے کا جو اک امکان تھا، وہ بھی گیا

اب بچا کر خود کو کیا کرنا ہے رخشندہ تمھیں
وہ جو تیرے حوصلوں کی جان تھا وہ بھی گیا

رخشندہ نوید

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

ہر قدم گوش بر آواز پھرے ہیں خالد
ہم نے جی بھر کے سنا، پختہ گھروں کا رونا

غزل

نسخہ ہائے عشق میں کیا ہے سنبھلنے کا ہنر
اس میں تو بس درج ہے جاں سے گذرنے کا ہنر

رات، دن، سورج، جوانی حسن، شام زندگی
چھین لے ان سے کوئی اے کاش ڈھلنے کا ہنر

مدتوں کی ایک لمحے میں شناسائی گئی
کس قدر مہنگا پڑا دل کو پرکھنے کا ہنر

گرچہ اس کوشش میں ٹوٹی ہے سدا شاخِ وجود
آ سکا ہم کو کسی صورت نہ جھکنے کا ہنر

اڑتی جاتی ہے مثالِ بادِ تند و تیز رو
زندگی کے ہاتھ کب آیا سرکنے کا ہنر

رہ گئی جم کر لبوں پر مستقل آہ و فغاں
وقت سے سیکھا نہیں ہم نے بدلنے کا ہنر

دے دیا ہے شمع نے محفل میں آج اس کا ثبوت
اس کو آتا ہے پگھلنے اور جلنے کا ہنر

خالدہ انور

غزل

ذرا ٹھہر کہ سہارا بدل نہ جائے کہیں
میں بے مکاں کا ٹھکانا بدل نہ جائے کہیں

یہی کنارا کسی اور کا کنارا نہ ہو
مجھے یہ ڈر ہے کہ دریا بدل نہ جائے کہیں

ہمیں قریب جو لایا ہے اتنی عجلت میں
کسی بھی وقت ستارہ بدل نہ جائے کہیں

کہانی کار کے تیور سے ایسے لگتا ہے
ذرا سی دیر میں قصہ بدل نہ جائے کہیں

قدم بڑھانے سے اقبال ہچکچاتا ہوں
عجیب خوف ہے رستہ بدل نہ جائے کہیں

اقبال سروبہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جسم تقدیر کی زنجیر پہن کر خالد
روح کا بوجھ سنبھالے کہ اٹھائے سائے

غزلیں

نظر ملا کے نظر میں سوال رکھتے ہو
بے سمت ہو کے سفر کا ملال رکھتے ہو

کبھی جو آئیں مرے ہاتھ وقت کی باگیں
میں مان لوں گا مرا تم خیال رکھتے ہو

سنبھال رکھنے میں یادیں تری مثالی ہوں
مجھے بھلانے میں تم بھی مثال رکھتے ہو

جدید لفظ کے سانچے میں تم نہیں ڈھلتے
قدیم حُسن ہو، شعری جمال رکھتے ہو

بہت قرار ہے دل کو تری توجہ سے
کہ بات بات جو کیڑے نکال رکھتے ہو

ہوئے کیوں در پے آزار اہلِ فن روشن
ضرور تم بھی کوئی تو کمال رکھتے ہو

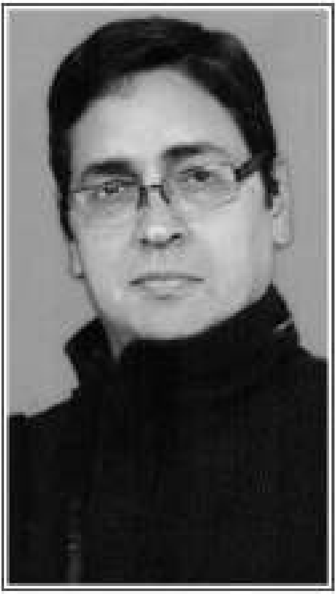

اعجاز روشن

ہمارے ساتھ کوئی اب وفا کرے نہ کرے
سفر نصیب ہیں منزل صدا کرے نہ کرے

کسی طرح تو یہ ابلیس ختم کرنا ہے
ہمی نے کرنا ہے آخر، خدا کرے نہ کرے

بندھی تو رہتی ہے یوں ڈور اک تعلق کی
وہ بد دعا کرے چاہے دعا کرے نہ کرے

ہوائیں ہم بھی تو اپنی سی باندھ رکھتے ہیں
نفس کو مٹھی سے یہ دل رہا کرے نہ کرے

میں لہلہاتا ہوں اک یاد کی تمازت میں
یہ چھاؤں زیست کی مجھ کو ہرا کرے نہ کرے

یقین ہونے لگا دل کے اس بھروسے پر
پڑے گی خیر اسے بھی صدا کرے نہ کرے

کُھلا ثبوت ہے یہ بھی زوال کا اپنے
ہیں سب خفا یہاں، کوئی خفا کرے نہ کرے

غزلیں

اشک آنکھوں سے بے خود سے بہاتے کب تھے
خواب پلکوں پہ مری جان جلاتے کب تھے

ہم کو الزام نہ دو ان کے بکھر جانے کا
خواب جو دل سے اُٹھے ہم نے تراشے کب تھے

ہم کو معلوم جو ہوتا تو نہ پیتی آنکھیں
اشک جو دل پہ گرے آگ بجھاتے کب تھے

اک ذرا صبر کہ تھوڑا سا تو جی لیں ہم بھی
عرضی اپنی تھی فقط اتنی، تقاضے کب تھے

بھیگی پلکیں تھیں ادھر اور ہنسی ہونٹوں پہ
وہ محبت میں رلاتے تھے، ہنساتے کب تھے

یہ تقاضے تھے محبت کے سہے ہنس ہنس کر
ورنہ ہم تیرے ستم دل پہ اٹھاتے کب تھے

اویس الحسن

ہجر موسم کے اترتے ہی بکھر جاتے ہیں
خواب جینے کو نکلتے ہیں تو مر جاتے ہیں

جس نے پہنا ہی نہیں اس کو بتانا کیسا
عشق چولے کے سوا رنگ اتر جاتے ہیں

تجھ کو معلوم کہاں ہجر کی بارش جاناں
یہ کٹورے تو ترے نام سے بھر جاتے ہیں

اجنبی راہ چلے جاتے ہیں پنچھی دل کے
مڑ کے دیکھیں جو کبھی راہ تو ڈر جاتے ہیں

ان گنت درد لپکتے ہیں لپٹ جانے کو
رنگ جب قوسِ قزح کے یوں نکھر جاتے ہیں

دل کے افلاک پہ چھائے ہوئے بادل کی قسم
بے ارادہ ترے کوچے سے گزر جاتے ہیں

عشق کے کتنے سمندر ہیں خدا ہی جانے
کشتیِ دل کی جو گزر جائے بکھر جاتے ہیں

غزل

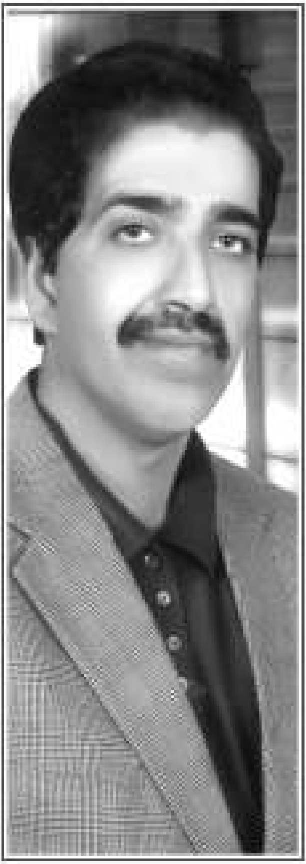

سروں پہ جب بھی کوئی سائبان ٹوٹتا ہے
زمیں سرکتی ہے اور آسمان ٹوٹتا ہے

کوئی تو ہے جو بچاتا ہے میری کشتی کو
سفر میں جب بھی مرا بادبان ٹوٹتا ہے

میں دل کی بات کو ہونٹوں پہ لا نہیں سکتا
مری زبان پہ آ کر بیان ٹوٹتا ہے

میں اپنی ذات کی تنہائیوں میں زندہ ہوں
تمام رات بدن کا مکان ٹوٹتا ہے

نہ جانے کتنے مسائل بلانے لگتے ہیں
تمھاری سمت سے جب میرا دھیان ٹوٹتا ہے

محمد نوید مرزا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

غزل کے ساتھ ہی خالد ہے جاں بھی نذرِ ندیم
کہ رُوحِ عصر کا آئینہ دار پاؤں اُسے

غزل

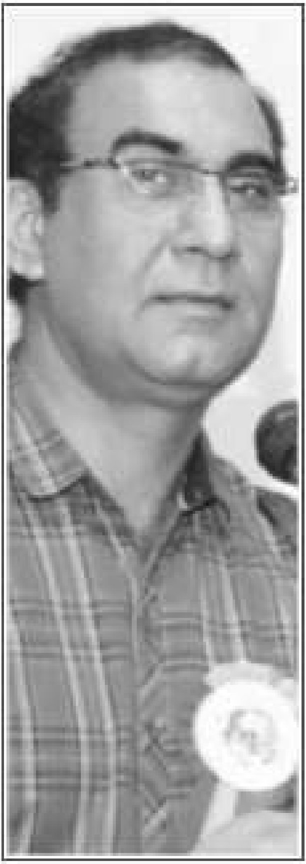

صغیر احمد صغیر

تم مری آنکھوں سے اندازہ لگا سکتے ہو
پھر بھی جانا ہی ضروری ہو تو جا سکتے ہو

کتنے پیارے ہو تمھیں خود بھی یہ معلوم نہیں
تم جسے چاہو اسے دام میں لا سکتے ہو

دل کی دھڑکن کو ذرا کان لگا کر سن لو
پھر مجھے چاہو تو رستہ بھی دکھا سکتے ہو

اک سمندر سی ہے گہرائی مرے سینے میں
تم نے جو کچھ بھی بتانا ہو بتا سکتے ہو

میں اکیلا ہوں گواہی بھی مری اپنی ہے
تم نے جس جس کو بلانا ہو بلا سکتے ہو

انتخاب

- خالد احمد -

گل سے یا گلستاں سے ملتا ہے
رنگ کو نم کہاں سے ملتا ہے

نعمان منظور

غزلیں

آخر ایسا کیا تھا جو مجبور ہوئے؟
اک اک کرکے سارے تجھ سے دور ہوئے

کتنے بہکے ہونگے تیری باتوں سے
کتنے تیری آنکھوں میں محصور ہوئے

اس کی قربت سے میں کوسوں دور ہی ٹھیک
ایرے غیرے لوگ جسے منظور ہوئے

کرچی کرچی ٹوٹ کے بکھرے رستے میں
چلتے چلتے تھک کر ایسے چور ہوئے

دل کی پرتیں کھولو گے تو جانو گے
کیسے کیسے درد یہاں مستور ہوئے

آنکھیں تو یہ نیند کے مارے سرخ ہوئیں
لوگ یہ سمجھے ہم مے سے مخمور ہوئے

تیرے آتے ہی آنگن میں جلتے دیپ
پہلے تھوڑا پھڑکے پھر بے نور ہوئے

عمران اعوان

ایک طوفان آنے والا ہے
وقت الٹا گھمانے والا ہے

پھر سے بدلیں گے زاویے سارے
ایسا بھونچال آنے والا ہے

چھوڑ دو کشتیاں سمندر میں
پانی بستی میں جانے والا ہے

یہ جو پنچھی بکھر گئے سارے
آسماں کچھ گرانے والا ہے

مجھ کو معلوم ہے پسِ پردا
کون فتویٰ لگانے والا ہے

اتنا خاموش وہ نہیں رہتا
کچھ تو سازش رچانے والا ہے

جس کو آنکھوں کا نور سمجھا تھا
وہ مرا گھر جلانے والا ہے

غزل

اپنا وفا شعار فقط غم بتائیں گے
جتنا بتائیں گے وہ مگر کم بتائیں گے

فطرت کے ساتھ حضرتِ انساں کی چھیڑ چھاڑ
کتنی تباہ کار ہے، موسم بتائیں گے

وہ نقشِ پا جو ثبت ہیں عرشِ بریں پہ دوست!
وہ نقشِ پا ہی رفعتِ آدم بتائیں گے

ہم نے چُنا ہے جن کو مسیحائی کے لیے
ہم کو علاجِ غم نہ وہ مرہم بتائیں گے

سینے پہ رکھ کے کان ذرا غور سے سُنو
ہم مبتلائے عشق ہیں کیا، دم بتائیں گے

اس واسطے بھی مجھ کو تعجب نہیں ہوا
میں جانتا تھا شہد کو وہ سم بتائیں گے

لکھیں گے ہم لباس کو پیراہنِ بہار
اور دامنوں کو دوستو! پرچم بتائیں گے

ہم توڑ دیں گے مدتوں کی اب یہ خامشی
ہم سے تو کس لیے ہُوا برہم بتائیں گے

اُس نے نبیل توڑ دیا ربطِ باہمی
ماتھے کے بَل جہاں کو یہ پیہم بتائیں گے

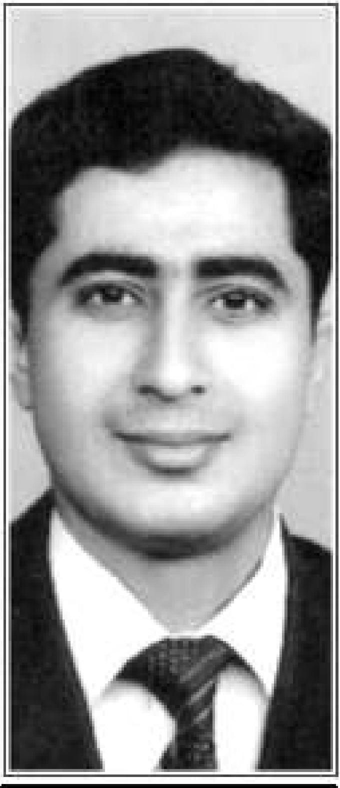

نبیل احمد نبیل

غزل

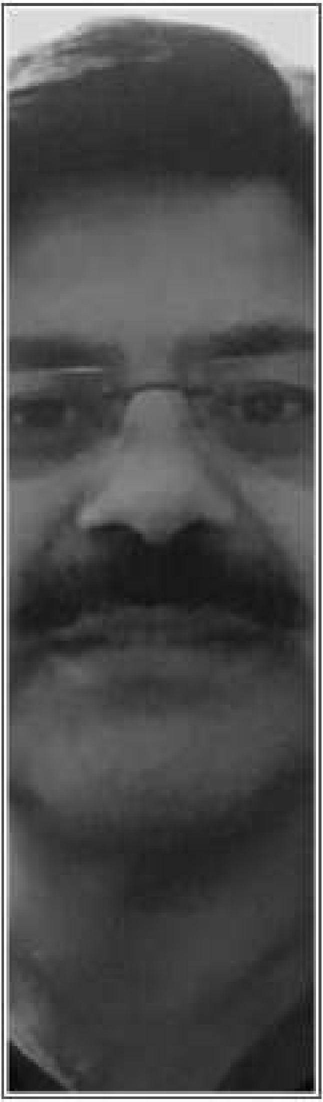

اپنے دامن میں اپنی حد میں رہے
ہر کوئی اپنے اپنے قد میں رہے

وہ محبت کی بات کیا کرتے
عمر بھر جو بلائے رد میں رہے

عکس بھی ان سے اجنبی ٹھہرے
جو کسی اور خال و خد میں رہے

آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہے
وہ کسی طور میری مد میں رہے

بزمِ یاراں میں وہ بلائے گئے
جو سدا سے شمارِ صد میں رہے

تھے گناہ و ثواب کے چکر
ہم معلق ازل ابد میں رہے

کسی خواہش کی نارسائی پر
آج کل ہر کوئی حسد میں رہے

اپنی پہچان پانے کو شاہد
مبتلائے تلاشِ جد میں رہے

شاہد فرید

غزلیں

دل میں غم ہوتا ہے اور آنکھ میں نم رکھتے ہیں
ہم اُداسی میں بھی خوشیوں کا بھرم رکھتے ہیں

ہم کہ ہوتے ہیں کسی دشت کی آندھی کی طرح
اپنے ہونے میں بھی اِک شانِ عدم رکھتے ہیں

ہم چرا لیتے ہیں کچھ ایسے بھی تم سے تم کو
جیسے پوشیدہ کوئی سینے میں غم رکھتے ہیں

شب کے سینے میں چُھپے راز کی صورت ہیں ہم
جو اُجالوں کو بھی تاریکی میں ضم رکھتے ہیں

پیاس ہونٹوں پہ سجا کر بھرے دریا کا بھرم
کوئی رکھتا نہیں جس طرح سے ہم رکھتے ہیں

اُس کی آنکھوں میں جو ہم ڈوبے تو جانا اشرف
ایسی گہرائی! سمندر بھی جو کم رکھتے ہیں

اشرف نقوی

چشمِ فلک میں ہے جو ستارہ چھپا ہوا
ممکن ہے کوئی غم ہو ہمارا چھپا ہوا

آنکھوں سے ایسے اشک رواں ہیں کہ جس طرح
دریا کے درمیاں ہو کنارہ چھپا ہوا

سمجھا نہیں ہے کوئی یہاں قسمتوں کا کھیل
ہے سود و فائدے میں خسارہ چھپا ہوا

ہم نے کہی جو آج غزل اِس میں ہے کہیں
بین السطور ذکر تمھارا چھپا ہوا

دیوار دو جہانوں کی ملتی ہے جس جگہ
شاید وہیں ہو کُن کا نظارہ چھپا ہوا

رُخ پر نقاب ڈال کے گزرے وہ، جس طرح
بادل کے پیچھے چاند ہو سارا چھپا ہوا

اشرف میں عشق زاد بظاہر ہوں مطمئن
رکھتا ہوں اپنے دل میں شرارہ چھپا ہوا

غزل

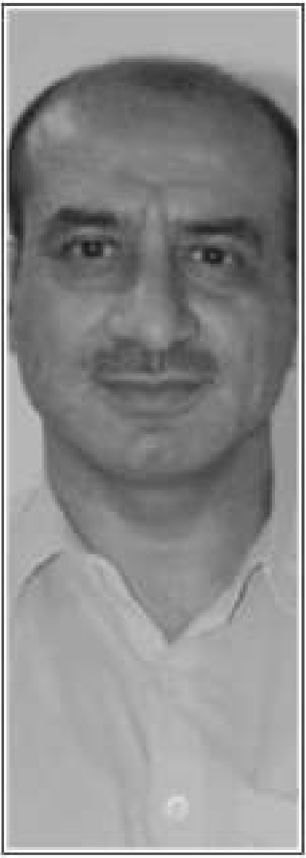

گھر سے نکل کے شہرِ تماشا کا رُخ کیا
اکتا گیا میں خود میں تو دُنیا کا رُخ کیا

آنکھوں میں دُھول اُڑی تو گیا دشت کی طرف
دل میں اٹھی جو لہر تو دریا کا رُخ کیا

موجودگی ہماری یہاں اک سوال تھی
جس کا جواب ڈھونڈنے ہر جا کا رُخ کیا

ہر رُخ سے پھر کنارہ کشی اِختیار کی
دنیا کی سمت لپکے، نہ عُقبا کا رخ کیا

اندھیر چھایا رہتا تھا آنکھوں کے سامنے
پھر ایک روز صبحِ مدینہ کا رخ کیا

شاہد کبھی نہ پائے گئے اپنے حال میں
ماضی میں جا رہے، کبھی فردا کا رخ کیا

شاہد ماکلی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر گلی، ماہ رخی، مہر سنی کے چرچے
کوئی سنتا ہی نہیں در بدروں کا رونا

غزل

روح اتنی نڈھال ہے بھائی
کھینچنا دم محال ہے بھائی

مال کی آرزو نہیں رکھتے
زندگی کا سوال ہے بھائی

غم سدا ہم رکاب رہتے ہیں
ساتھ تو بے مثال ہے بھائی

بولتا ہے سکوت کمرے میں
گفتگو بھی کمال ہے بھائی

موت آتی نہیں حقیقت میں
زندگی بھی خیال ہے بھائی

لوگ جس کو جنوب کہتے ہیں
اس طرف تو شمال ہے بھائی

مکتبِ عشق کے نصابوں میں
خودکشی بھی حلال ہے بھائی

آرزو بن گئی خطا میری
بس اسی کا ملال ہے بھائی

بولتا ہے قلوب میں کوئی
یا لہو کی دھمال ہے بھائی

قافلے منزلیں سبھی کچھ ہے
داستاں لازوال ہے بھائی

شاعری تو مجھے نہیں آتی
میرے دل کا ابال ہے بھائی

یہ دیا ہے کسی سکندر نے
ہاتھ میں جو رومال ہے بھائی

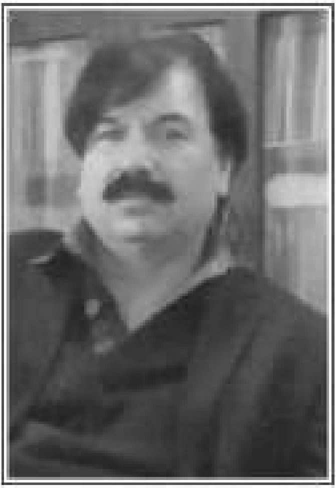

مرزا سکندر بیگ

غزل

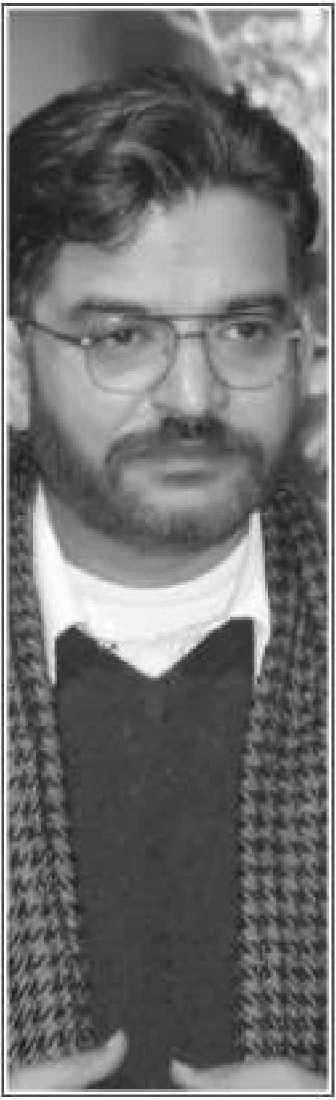

عون الحسن غازی

چپ سے رہتے ہو مسکراتے ہو
کیا خبر ہم سے کیا چھپاتے ہو

یہی اندازِ گفتگو ہے کیا
بات کرتے ہی بھول جاتے ہو

ہوش مندی ہے یا کہ مستی ہے
رقص کرکے اُسے دکھاتے ہو

بھول جاتے ہو دن نکلتے ہی
رات بھر جاگ کر جگاتے ہو

عشق میں جیت کا تصور کیا
اور تم ہو کہ جیت جاتے ہو

نیا سورج نکلنے والا ہے
کیوں پرانے چراغ لاتے ہو

میں نے خود کو ابھی نہیں دیکھا
کس لیے آئنہ دیکھاتے ہو

تم بھی غازی عجیب ہو پیاسے
جا کے دریا پہ لوٹ آتے ہو

غزل

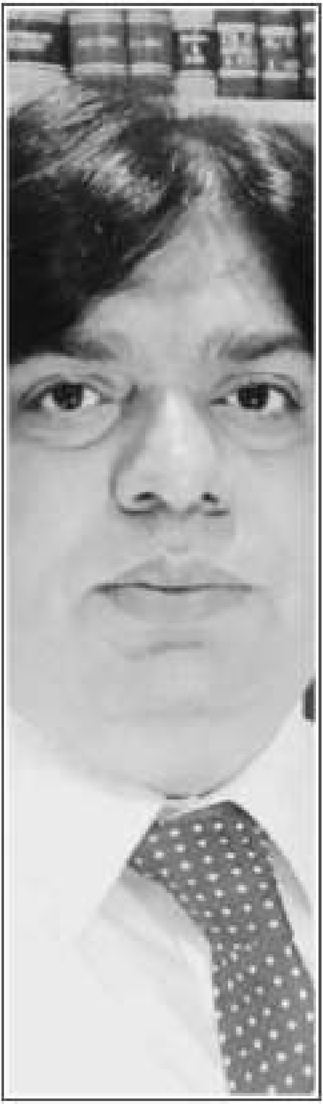

شعر کہنے میں سہولت اور ہے
ان دنوں مجھ کو محبت اور ہے

کیوں مثالیں دیتا ہے فردوس کی
ماں کے قدموں میں تو جنت اور ہے

شہر میں گمنام رہ جاتا مگر
دشت میں مجنوں کی عزت اور ہے

جب تمہارے ساتھ ہوتا ہوں کہیں
مجھ کو لگتا ہے کہ قسمت اور ہے

بارشوں میں اور ہوتا ہے جنوں
چاندنی راتوں میں وحشت اور ہے

جابجا پھولوں پہ اڑتی تتلیاں
فصل گل میں دل کی حالت اور ہے

عشق میں رسوائیاں ہیں افتخار
ہو اگر سچا تو عزت اور ہے

افتخار شوکت

غزل

آج میری انا نے حد کر دی
ہاتھ آئی خدائی رد کر دی

دیکھ درویش نے مری چادر
مسندِ شہ سے مستند کر دی

اس طرح بھی کوئی بچھڑتا ہے
اُس نے اس بار یار حد کر دی

میں نے لکھے بغیر عرضی دی
اس نے دیکھے بغیر رد کر دی

حسن میں اک یہی قباحت ہے
ہر کہ کر دی نگاہِ بد کر دی

پیشکش کی گئی تھی شاہی کی
جو فقیروں نے مسترد کر دی

کام جو بھی کیا مثال بنا
بات جو بھی کہی سند کر دی

لوٹ کر پانچ سات کو راحت
ایک دو چار کی مدد کر دی

راحت سرحدی

غزل

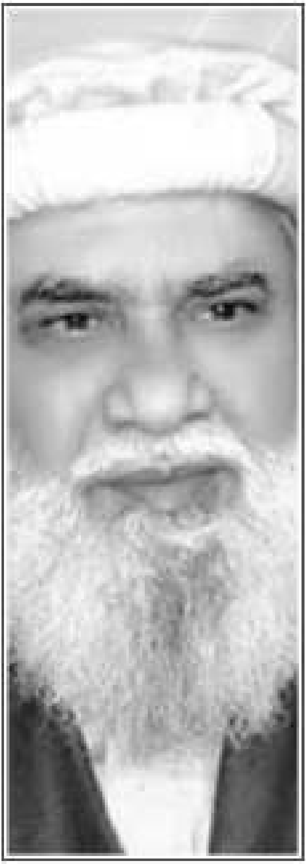

اک شعر جو کسی کو سنایا نہیں گیا
پلکوں تک آ گیا تھا گرایا نہیں گیا

آنکھوں سے خود بخود ہی مناظر چھلک پڑے
اک خواب تھا جو ہم سے بچایا نہیں گیا

رکھنا تھا جس کو یاد اُسی کو بھلا دیا
اور جس کو بھولنا تھا ، بھلایا نہیں گیا

کیا کیا عمل کیے گئے کیا کیا جتن کیے
آنگن سے آج بھی مرے سایہ نہیں گیا

لکھا گیا تھا ڈوبنا جس جس کے واسطے
کشتی میں کوئی ایسا بٹھایا نہیں گیا

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کیسی ٹھنڈی ہوا چلی خالد
چاند کیا ، جل بجھے ستارے بھی

غزل

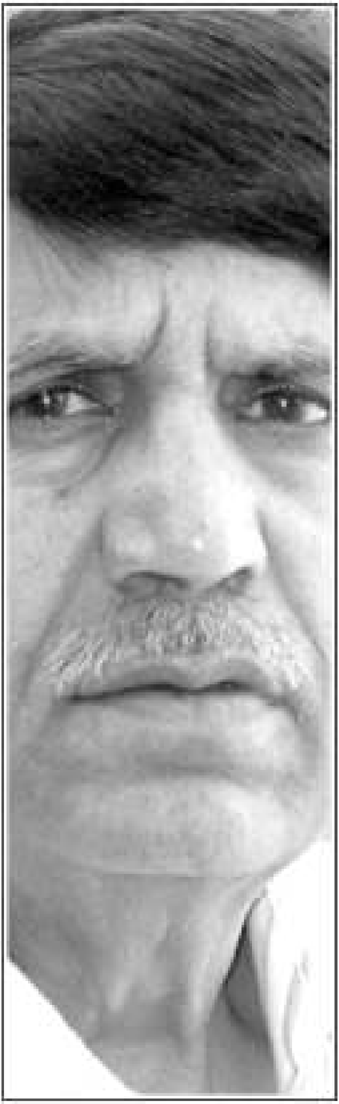

کلام ختم ہُوا اور سفر تمام ہُوا
نئے سرے سے تماشے کا اہتمام ہوا

لکھا گیا ہے سنہری حروف میں قصہ
امیرِ وقت کا لکھا ہی انتظام ہُوا

ذرا سے ایک تبسم پہ بات ختم ہوئی
عجب طرح سے تھا وہ نامہ و پیام ہُوا

کمال میں نہیں اپنے زوال میں وہ کھُلا
تو معنی خیز تھا عظمی سکوتِ شام ہُوا

کہ اپنے عکس سے باتیں بہت تھیں کیں میں نے
دنوں کے بعد تھا میں خود سے ہم کلام ہُوا

یہ حسنِ ظن ہے یہاں اس سے کام چلتا ہے
یہاں پہ کوئی نہیں ایسے نیک نام ہُوا

یہ تذکرہ محبت ہے عاشقاں کے لیے
نہیں ہے ورنہ کسی کو بھی یاں دوام ہُوا

بیان تیرا اے واعظ سمجھ میں آیا نہیں
کہ عظمی اپنے لیے پختہ بھی تو خام ہُوا

اسلام عظمی

غزلیں

اک محبت کے سوا باب میں رکھا کیا ہے
مجھ ترے نام، مرے خواب میں رکھا کیا ہے

عشق تو راکھ کو بھی نور بنا دیتا ہے
مِل مجھے، نام میں اَنساب میں رکھا کیا ہے

اک کشش، کھینچ کے لے جائے اُدھر کو، ورنہ
ہالۂ ہجر ہے، مہتاب میں رکھا کیا ہے

چھوڑ آئے ہوئے تو کچھ صبر سکھاؤ دل کو
اب وہاں خطۂ شاداب میں رکھا کیا ہے

اونچے مینار سے دیکھو تو الگ دیتا ہے
تنگ ہوتے ہوئے محراب میں رکھا کیا ہے

بیٹھ درویش کے حجرے میں، دیے کی لو میں
چڑھتے سورج کے تب و تاب میں رکھا کیا ہے

قیوم طاہر

اُس کے دکھ اپنے، مرے غم اپنے
ہم کو خوش آ گئے موسم اپنے

گردِ افلاک و زمیں کو جھاڑا
ہو نہیں پائے مگر ہم اپنے

باتیں ، شہنائی بجاتی تھیں کبھی
کتنے چپ چاپ ہیں سرگم اپنے

پہلے لگتا تھا کہ ہم ہی ہم ہیں
وقت نے سیدھے کیے خم اپنے

یار ملتے تھے خوشی ہوتی تھی
مل کے اب کرتے ہیں ماتم اپنے

خول پر چڑھتا گیا ہے ریشم
دائرے بڑھ گئے پیہم اپنے

ہم میں اک زعمِ جہانداری ہے
ہو نہیں پائے مگر ہم اپنے

سوکھے پھولوں سے ہوئے ہیں طاہر
رنگ و خوشبو بھرے البم اپنے

غزل

اُودے پیلے اور نارنجی یادوں جیسے دن
خوابوں ہی میں رہ جاتے ہیں خوابوں جیسے دن

دُھوپ نگر میں پھرتے تھے اور دُھوپ نہ لگتی تھی
عُمروں کی پاتال سے نِکلے چھاؤں جیسے دن

کچے پکے موسم اور جذبوں کا تیز نشہ
جِسموں کو مہکاتے سُرخ گُلابوں جیسے دن

جگنو جیسی ایک دُعا اور چاندی کا تعویذ
ہاتھ پکڑ کر رستہ دیتے ماؤں جیسے دن

لَوٹ کے اب نہ آئیں گے میں جانتی ہوں فرحت
گالوں کو تھپکاتے راج دُلاروں جیسے دن

فرحت زاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

حُسنِ محبت، حُسنِ سماعت ہے اپنے یاروں کا
دفترِ بے معنی ہیں ورنہ خالد کی تحریریں

غزل

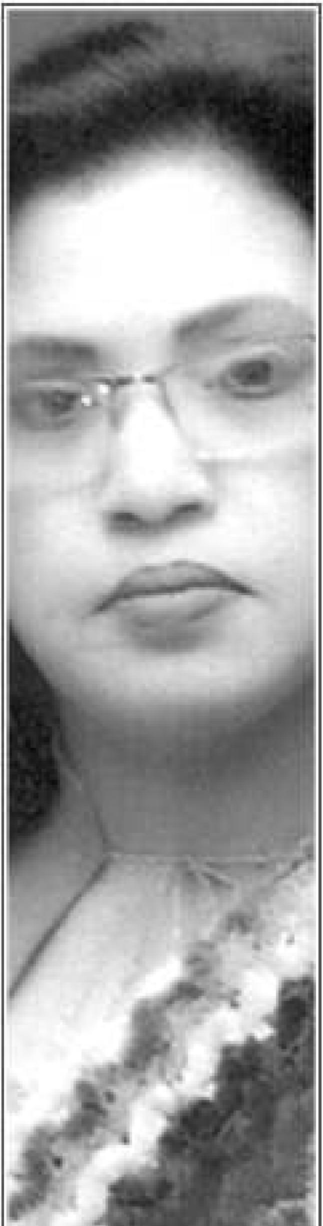

کبھی کسی سے تو کچھ بھی نہیں کہا میرے دوست
وہی ملا ہے جو تو نے مجھے دیا میرے دوست

میں چوکھٹوں کا بڑا احترام کرتی ہوں
مگر یہ سجدہ کسی اور کو روا میرے دوست

یہ سانسیں قرض ہیں اک دن تو واپسی ہوگی
میرے وجود میں کتنا کوئی جیا میرے دوست

مرا یقین پرندے پلٹ کے آئیں گے
زمینِ دل پہ کوئی پیڑ تو لگا میرے دوست

فصیلِ درد کی تاریکیاں تو کچھ بھی نہیں
تو روشنی کی طرف ہاتھ تو بڑھا میرے دوست

میں خود کو دیکھوں تو دیکھوں تری نگاہوں سے
مری نظر سے کبھی تو نظر ملا میرے دوست

نظر ملاتے ہی منظر بدلتے جائیں گے
کنارِ آبِ جُو کوئی کنول کھلا میرے دوست

آسناتھ کنول

غزل

ضرور ہوں گے ترے نجم و ماہتاب الگ
ہے میرے چاند ستارے کی آب و تاب الگ

چمن ہمارے بزرگوں نے خوں سے سینچا تھا
سو، اس کے سرو و سمن مختلف، گلاب الگ

مری زمین کا ہر ذرہ ہو گیا روشن
مری زمیں پہ چمکتا ہے آفتاب الگ

نہ رکھا پیار میں ہم نے حسابِ سود و زیاں
ہمارے مہر و مروت کے سارے باب الگ

یہ مٹی جس میں لہو ہے مرے شہیدوں کا
سکوں بھی اس کی محبت میں اور ثواب الگ

مرا وطن تو ہے مرکز مری اُمیدوں کا
میں کیسے رکھ دوں اٹھا کر سب اپنے خواب الگ

افشاں سجاد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جنگ دو گز زمین کی خالد
ہم نے اک عمر لڑ کے ہاری ہے

غزل

ہم سفر تھے مگر اک حذر درمیاں
چاند تارے تو تھے پر نہیں آسماں

جو گلے سے لگے وہ تو جاں سے گئے
ہاتھ تھاما ہی تھا اور فگار انگلیاں

خود نمائی کے بس کی یہ باتیں نہیں
آگ تھی ہی نہیں اٹھ رہا تھا دھواں

ہر قدم منزلیں رقص میں ہیں مگن
راستوں کے نشاں درد کے چیستاں

بے نیازی کے ہاتھوں میں کشکول تھے
اور طلب کی خطا الاماں ! الاماں

پیڑ کی جڑ تنے میں نہیں ڈھل سکی
لعل پا کے بھی خالی رہیں سیپیاں

وہم کی حد سے آگے بھی موہوم ہے
ثبت جو ہو گیا اس کا کیسا نشاں

سعدیہ بشیر

غزل

تُو ہے تو مرے ہونے کا امکان بھی ہو گا
اور مرحلۂ شوق یہ آسان بھی ہو گا

ایسے ہی چھلکتے نہیں ساگر کے کنارے
تہہ میں کہیں اس کے کوئی طوفان بھی ہو گا

قیدی سبھی مجرم نہیں ہوتے ہیں کہیں بھی
زنداں میں کوئی یوسفِ کنعان بھی ہو گا

یادوں میں ہمارے وہی گلیاں وہی گھر ہیں
یادوں میں تمہاری وہی دالان بھی ہو گا

کچھ لوگوں کی باتوں سے یہاں پھول جھڑیں گے
آنکھوں سے محبت بھرا اعلان بھی ہو گا

شبہ طراز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے فلک، کب ترے چہرے پہ شفق پھولے گی
رنگ کب لائے گا بجھتی سحروں کا رونا

غزلیں

جب تصور میں حسین تتلی کا پر آتا ہے
میرا بچپن مری آنکھوں میں اتر آتا ہے

گو کہ عورت ہوں مگر اتنی بھی کمزور نہیں
مجھ کو آنچل کی حفاظت کا ہنر آتا ہے

اس محبت کے سفر میں تو کڑی دھوپ ہی ہے
تم تو کہتے تھے کہ رستے میں شجر آتا ہے

یہ ترا غم بھی وفادار بہت ہے مجھ سے
میں جدھر جاؤں یہ کم بخت ادھر آتا ہے

کتنا ویران ہے عاشی یہ مری آس کا پیڑ
پھول آتے ہیں نہ شاخوں پہ ثمر آتا ہے

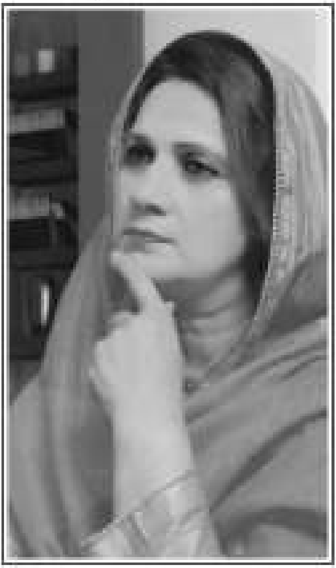

عائشہ ظفر

رات دروازہ تھا بجا شاید
یا کوئی وہم تھا مرا شاید

میں نے دالان تک تو دیکھا تھا
حوصلہ پھر نہیں رہا شائد

اس کے لہجے میں سرد مہری تھی
یا مجھے تھا یونہی لگا شاید

زندگی وسوسوں میں گزری ہے
شک میں سب کچھ گنوا دیا شاید

جاتے جاتے بھی وہ نہیں پلٹا
کوئی وعدہ نبھا گیا شاید

عقل کہتی رہی کہ رک جاؤ
عشق نے ہی نہیں سنا شاید

بات کرنی تھی اپنے بارے میں
ہو گیا تیرا تذکرہ شاید

اک زمانہ ٹھہر گیا جیسے
ایک لمحہ گزر گیا شاید

غزل

کوئی منزل نہ ٹھکانہ تھا، چلے جانا تھا
دو گھڑی کے لیے آنا تھا، چلے جانا تھا

آپ سب راستے مسدود نہ کرتے پھر بھی
آخری عہد نبھانا تھا، چلے جانا تھا

شکوہ کرنا ہی نہ تھا تند ہواؤں سے مجھے
اک چراغ اور جلانا تھا، چلے جانا تھا

تجھ پہ الزام نہ تھا پاؤں کے چھالوں کی قسم
اور جہاں تک ہمیں جانا تھا، چلے جانا تھا

کس میں جرأت تھی، مرے عزمِ سفر کو توڑے
رنج رفتہ کو بھلانا تھا، چلے جانا تھا

شعلۂ جاں کی تپش اور بھی بڑھ جاتی تھی
تم نے اک اشک بہانا تھا، چلے جانا تھا

سرکشی زخم کو بھی کرنے نہیں دینی تھی
داغ اشکوں سے مٹانا تھا، چلے جانا تھا

شعر الزام کی صورت نہیں بننے دینا
راز پرتوں میں چھپانا تھا، چلے جانا تھا

عنبرین آئنہ کرنا تھا مجھے قلبِ حزیں
اس میں اک عکس سجانا تھا، چلے جانا تھا

عنبرین خان

غزلیں

تمہیں لگتا ہے آساں بھول جانا
چلو اچھا ہے جاناں بھول جانا

کہ اینٹوں سے کہاں بنتا ہے یہ گھر
یہ ارماں ہے تو ارماں بھول جانا

بڑا مشکل ہے رستہ واپسی کا
جو باندھا تھا وہ پیماں بھول جانا

تمہاری ضد نبھانا چاہتی تھی
نہ تھا اتنا بھی آساں بھول جانا

تمہارا دل یہیں پر رہ گیا تھا
یہ کیا عادت ہے ساماں بھول جانا

مجھے آسانیاں بھاتی نہیں ہیں
نہیں آساں وہ زنداں بھول جانا

نائلہ راٹھور

ہم تھے جب رُوپوشی میں
ہونٹ ملے سرگوشی میں

ذات کا پردہ چاک کیا
اُس کی پردہ پوشی میں

جنت میں آ نکلی ہوں
اُس کی ہم آغوشی میں

کتنے پھول کمائے ہیں
اُس نے عطر فروشی میں

وہ بھی مجھ میں مست رہا
میں بھی تھی مدھوشی میں

گہری کالی رات میں بھی
آگ سی بھڑکی روشی میں

نیل گگن پر اڑتی ہوں
میں اُس کی ہمدوشی میں

سارے شہر نے گونج سنی
دونوں کی خاموشی میں

روشی زیب

غزلیں

رخسانہ سمن

وقت بدلا تو مری چپ کو بھی دھو کے بولے
غیر خاموش ہوئے تو مرے اپنے بولے

میں اکیلی تھی تخیل کے کسی کمرے میں
خامشی بڑھنے لگی تو کئی چہرے بولے

رونا بھی ذہن میں رکھنا مرے خوش باش بجن
نفع جب حد سے بڑھا تب ہی خسارے بولے

ان کی تعبیر پسِ پشت رکھی تھی لیکن
ٹوٹنے لگ گئی جب آنکھ تو سپنے بولے

مشکل میں ہے حیات، ابھی وہ نشے میں ہے
کرنا نہ کوئی بات، ابھی وہ نشے میں ہے

سارے گناہ تھوپ دو...... اجڑی عوام پر
ہے شاہ کی نجات، ابھی وہ نشے میں ہے

مستی بہار کی ہے، سو! جھومے گا ہر شجر
گرنا ہے پات پات، ابھی وہ نشے میں ہے

چرخے کی کوک میں ہے کی ایک ہوک کی
دیکھا ہے کات کات، ابھی وہ نشے میں ہے

دن تو گزار لوں گی کوئی جھوٹ بول کر
بیتے گی کیسے رات، ابھی وہ نشے میں ہے

مانگا ہے گل! جو ہاتھ بھی، لڑکی غریب کا
دیکھے گا ذات پات، ابھی وہ نشے میں ہے

کوکی گل

غزل

چھوڑ کر جا چکے ہیں جب سے وفا دار مجھے
سر پہ اک بوجھ سا لگتی ہے یہ دستار مجھے

ایک پتلی سا نہیں چاہیے کردار مجھے
اس سے بہتر ہے کہانی میں ابھی مار مجھے

کاٹ کر پیڑ کو جو صحن میں تعمیر ہوئی
مار ڈالے گی کسی روز یہ دیوار مجھے

اس قدر رات اداسی تھی کہ حالت پہ مری
رو پڑا حوصلہ دیتے ہوئے غم خوار مجھے

میں خوشی سے تو نہیں بیچنے آیا خود کو
کھینچ لائی ہے ضرورت سرِ بازار مجھے

ان کے رونے کا سبب ہے مرے شبیر کا غم
کیوں نہ ہوں جان سے پیارے یہ عزادار مجھے

چھوڑ جائے جو مفادات کی خاطر اکمل
ایسے لشکر سے کہیں اچھے ہیں دو چار مجھے

اکمل حنیف

غزل

زعمِ باطل ہے کہ جو تو نے کہا مان لیا
تیرے کہنے پہ کہاں تجھ کو خدا مان لیا

پھول کھلتے چلے جاتے تھے جلو میں اُس کے
ہم نے اُس حسنِ سبک رو کو صبا مان لیا

ہم دلیلوں کے زمانے سے ہیں یوں تو لیکن
احتراماً ترے گیسو کو گھٹا مان لیا

آپ فرعون نہیں ، قیصر و شداد نہیں
آپ جو چاہیں، کریں، سب ہے بجا، مان لیا

آپ کے سامنے سب ہیچ ہیں دنیا کے فسوں
آپ کے ہاتھ لگا ہے جو عصا ، مان لیا

عشقِ گم راہ سے توبہ پہ رہائی ممکن
آپ کے بس میں ہے میثاقِ بقا مان لیا

حوصلہ ، ہم نفساں ! دیکھو ہمارا ، ہم نے
عصرِ کم ظرف کے بونوں کو بڑا مان لیا

آپ کے ساتھ نہ تھیں آپ کے بارے میں نہ تھیں
آپ نے کیوں مری باتوں کا برا مان لیا

رانا غلام محی الدین

غزلیں

کس طرح گزرے گی میری زندگی تیرے بغیر
پھیلتی جاتی ہے دِل میں بے کلی تیرے بغیر

دِل شکن لہجہ ترا دیکھا تو پچھتایا بہت
میں نے کیوں ٹھکرائی اپنی ہر خوشی تیرے بغیر

تُو گیا تو کھو گئی ہے شہر میں پہچان بھی
ہو گیا ہے اُجنبی ہر آدمی تیرے بغیر

تُو اگر قائل دُکھی ہو بھی گیا تیرا نصیب
اُس پہ بھی طاری رہے گی جاں کنی تیرے بغیر

جاتے جاتے کاش اِتنا ہی بتا جاتے مجھے
میں رکھوں کس سے اُمیدِ دوستی تیرے بغیر

پھول پژمردہ، اُداسی چارسُو ہے محوِ رقص
غم زدہ، گریہ کناں ہے ہر کلی تیرے بغیر

عمر قیاز قائل

دِل جلانے سے کچھ نہیں ہو گا
اُن کے آنے سے کچھ نہیں ہو گا

غم کے عالم میں دُکھ کے موسم میں
مُسکرانے سے کچھ نہیں ہو گا

جب مراسم نہیں رہے تجھ سے
تیرے جانے سے کچھ نہیں ہو گا

جیت بھی دے سکے گی کیا راحت
ہار جانے سے کچھ نہیں ہو گا

وہ تغافل پسند ہے قائل
دُکھ سُنانے سے کچھ نہیں ہو گا

بیتی باتوں کا تذکرہ چھوڑو
اس فسانے سے کچھ نہیں ہو گا

اُس کا جب میں نہیں رہا قائل
گیت گانے سے کچھ نہیں ہو گا

غزل

محمود کیفی

مغرور تھا بہت ، اُسے مجبور کر دیا
قسمت نے راجپوت کو مزدور کر دیا

گنوا کے اپنی ٹانگ ، لگا بھیک مانگنے
اِک شخص روزگار نے معذور کر دیا

کتنے ہی لوگ شہر میں گُمنام مر گئے
شاعر کو ایک شعر نے مشہور کر دیا

آئی ہیں اِس طرح سے غلط فہمیاں قریب
کچھ دوستوں کو دوستوں سے دور کر دیا

تُو ایک عام، سادہ سی لڑکی تھی گاؤں کی
شاعر نے تجھ سے پیار کیا، حور کر دیا

پہلے خیال سے ملی دل کو بہت خوشی
پھر دوسرے خیال نے رنجور کر دیا

کیفی عمل پہ اپنے ذرا پھر سے غور کر
کس شے نے تیرے چہرے کو بے نور کر دیا

غزل

یہ جو لگتے ہیں تازیانے سے
ہیں تمہارے ہی آستانے سے

آسماں آ گیا تھا سکتے میں
جب زمیں مل گئی زمانے سے

میرا کمرہ بھی نہ رہا میرا
تیری تصویر کے لگانے سے

وہ سرِ بزم آئے حیلے سے
اور ہم بھی اٹھے بہانے سے

بعد مدت کے دل میں کیا جھانکا
غم دھڑکنے لگے پرانے سے

ہر طرف روشنی تھرکنے لگی
اک ترے دوست مسکرانے سے

جب سے جانا ہے عشق کا مطلب
ڈر گیا ہوں میں مسکرانے سے

درد کی یہ بھی اک مصیبت ہے
اور بڑھتا ہے بھول جانے سے

میری آنکھوں کا مسئلہ ہے یہ
جلنے لگتیں ہیں خواب آنے سے

سانس آتی ہے جس کے آنے پر
جان جاتی ہے اس کے جانے سے

عشق کی ہے یہ شعبدہ بازی
چین ملتا ہے تلملانے سے

جس پرندے سے تھا شجر آباد
اڑ گیا آج آشیانے سے

چاک پر کب سے تھی پڑی مٹی
شکل ابھری مرے گھمانے سے

میں تو انصر یہ جان پایا ہوں
اور جاگے ہیں غم مٹانے سے

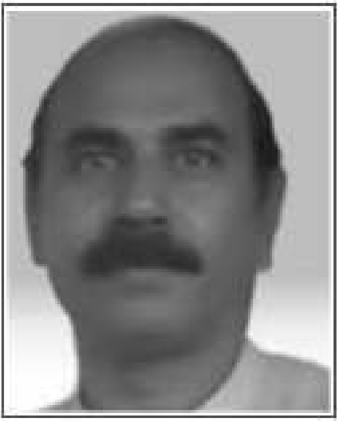

انصر رشید انصر

غزلیں

دیکھ رہا تھا خود دریا
کوئی پیاسا ڈوب گیا

عقل سمجھنے سے قاصر
کتنے درجوں میں ہے خدا

ظلم زمیں پر ہوتا ہے
لرزاں ہے کیوں روحِ خدا

روشنی اور سیاہی ایک
تشنہ لبی بھرتی ہے کیا

پوجا اُس کی دان اُس کا
رب سے بشر کا رشتہ کیا

میتھیو محسن

دردِ دل کا چھپا کے چلنا ہے
رسمِ الفت نبھا کے چلنا ہے

ظلمتوں میں یقیں اُجالوں کا
اپنے دل میں جگا کے چلنا ہے

سخت سنگین ہے رہِ ہستی
اپنے سپنے بچا کے چلنا ہے

کچھ بھروسا نہیں حقیقت کا
بس فسانہ سنا کے چلنا ہے

بھول پاؤ گے تم نہ وہ چہرہ
جس کی یادیں بھلا کے چلنا ہے

غزل

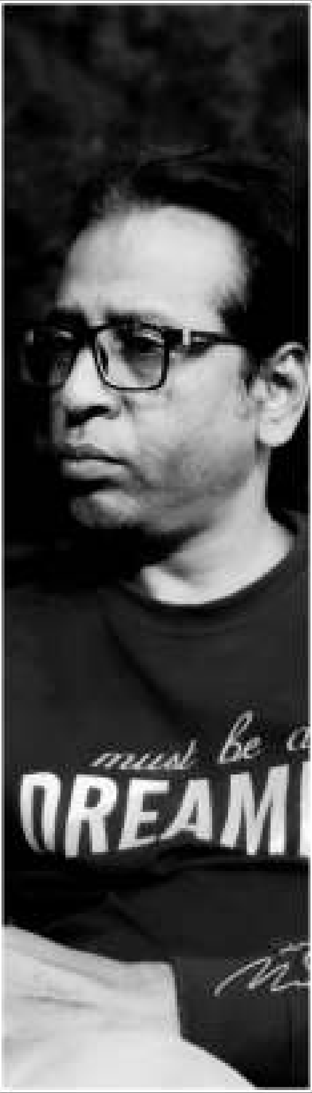

گم نام شعر تھا مَیں، حوالے میں آ گیا
شب سے نکل کے دن کے اجالے میں آ گیا

ٹوٹا ہوا تو تھا مَیں پہ بکھرا ابھی نہ تھا
اچھا ہوا کہ تیرے سنبھالے میں آ گیا

اِک یاد اثر پذیر ہوئی اِس طرح کہ بس
دل کا نمک نکل کے نوالے میں آ گیا

دیکھا ہے جانے دیکھنے والے نے کس طرح
منظر سمٹ کے دیکھنے والے میں آ گیا

مَیں بات کر رہا ہوں کسی اور شخص کی
اے دوست! کس لیے تو ابالے میں آ گیا

کوئی خطا اگر نہیں تجھ سے ہوئی تو پھر
پیوندِ رنج کیسے دوشالے میں آ گیا

تم بات کر رہے ہو میاں اِک چراغ کی
سورج بھی میرے چاند کے ہالے میں آ گیا

شبیر نازش

غزل

میرا دعویٰ ہے زمانے سے بچالے گا مجھے
میں اگر روٹھ بھی جاؤں تو منالے گا مجھے

پھول بن کر جو کھلا ہوں اسی امید کے ساتھ
توڑ کے اپنے وہ بالوں میں سجالے گا مجھے

آنکھ بھر کر مجھے دیکھے گا وہ پہلے پہلے
اور پھر چپکے سے خوابوں میں چھپالے گا مجھے

میں یہ سمجھوں گا کہ منزل ہے مرے ہاتھوں میں
صرف اک بار جو سینے سے لگالے گا مجھے

مجھ کو معلوم ہے وہ حسن کا جادوگر ہے
اپنی زلفوں کی گھنی شام بنالے گا مجھے

میرے ہاتھوں میں مہ وسال چمک اٹھیں گے
آسماں وقت کی زنجیر بنالے گا مجھے

وہ مسیحا ہے مرے شہر کے ویرانے میں
اس خرابے سے زعیم آ کے بچالے گا مجھے

زعیم رشید

غزل

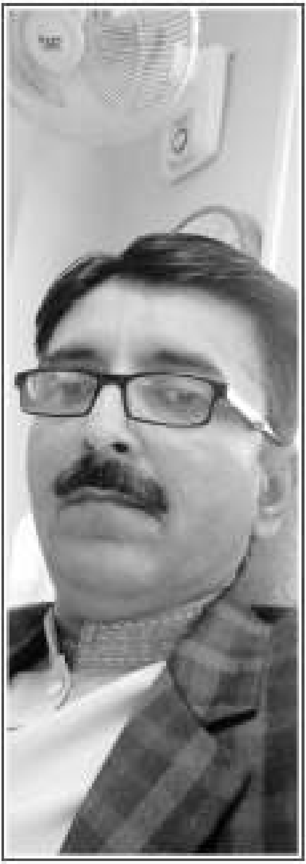

کون تھا جس نے حیرانی کو منظر پر تحریر کیا
کون سی آنکھ نے ایک تحیر ساگر پر تحریر کیا

پچھتاوے سے، تخت کے اترے، ڈھاریں مارے کے روئے تھے
جب درویش نے اڑتی دھول سے امبر پر تحریر کیا

ناز و ادا سے چھن چھن کرتی ہنستی کنگن وان کری
شوخی سے مسکان کو اپنی، جھومر پر تحریر کیا

آتے جاتے آنکھ کے پتھر زخمی کرتے رہتے تھے
اس نے اپنے درد کا نوحہ گاگر پر تحریر کیا

ہجر کی شب کو، دکھتے پیکر، جلتی آنکھوں والوں نے
کروٹ کروٹ اپنا دکھڑا بستر پر تحریر کیا

محمد نور آسی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تن آج جلایا ہے، کل راکھ اُڑا دیں گے
وہ نام کو دو دن میں، دشنام بنا دیں گے

غزل

نیند میں تھا تمہیں بھلانے کو
اور تم آ گئے جگانے کو

میں نے سگرٹ بجھا کے سانس لیا
آگ لگنے لگی زمانے کو

جانے کیا شے بچا رہا ہوں میں
ویسے کچھ بھی نہیں بچانے کو

اب میں خالی گلاس دیکھوں کیا؟
کیوں بلایا مجھے پلانے کو

ابھی باتیں بہت سی کی نہیں ہیں
شعر کچھ رہ گئے سنانے کو

نعیم رضا بھٹی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بن کر سپردگی کا تصور پگھل کے آ
مجھ تک تو اپنے جسم کے شعلوں پہ چل کے آ

غزلیں

یہ لوگ کہتے ہیں اکثر دہائی دیتا ہوں
میں اپنے آپ کو کم کم سنائی دیتا ہوں

مجال ہے جو کروں ایک کوڑی پس انداز
میں سانس لیتا ہوں اور پائی پائی دیتا ہوں

معاملات میں ہوں گرم جوشی کا قائل
میں خال خال ہی دل تک رسائی دیتا ہوں

عجیب بات پرندہ اڑان بھرتا نہیں
قفس کو توڑ کے جب بھی رہائی دیتا ہوں

شریکِ جرم نہیں ہوں تو کس لیے جاذبؔ
ہر ایک شخص کو اپنی صفائی دیتا ہوں

اکرم جاذب

اسیر ہو کے میں ایسی اڑان ہو گیا ہوں
زمیں پہ رہتے ہوئے آسمان ہو گیا ہوں

وہ حسنِ ظن مرا سب دوستوں کی بابت ہے
کہ اپنے بارے میں خود بدگمان ہو گیا ہوں

ثبوت چاہیے منصف کو اور نہ مدعی کو
خلاف اپنے میں ایسا بیان ہو گیا ہوں

کسی کے سایۂ دیوار کی طلب نہیں کی
بڑھی جو دھوپ تو خود سائبان ہو گیا ہوں

گریز کرتا ہوا اختلاف رائے سے
میں ہم خیال نہیں ہم زبان ہو گیا ہوں

کسی نے پہلی نظر میں کیا مجھے ازبر
کڑا کسی کے لیے امتحان ہو گیا ہوں

ضرور ظلم کیا ہو گا جان پر جاذبؔ
میں خود پہ اتنا اگر مہربان ہو گیا ہوں

غزل

مجھے کیوں نارسا رکھا گیا ہے
بے وجہ و بے خطا رکھا گیا ہے

ادھورا تھا ادھورا ہوں میں اب بھی
مجھے خود سے جدا رکھا گیا ہے

سما کر مجھ میں کیوں مجھ سے نہاں ہو
عجب یہ سلسلہ رکھا گیا ہے

تو قلزم میں فقط ہوں ایک قطرہ
تو پھر کیوں فاصلہ رکھا گیا ہے

ابھی کچھ حسرتیں ہیں دل میں باقی
کچھ ان کا بھی "صلہ" رکھا گیا ہے

میں پھر بھی کیوں اندھیرے میں ہوں جبکہ
میرے سر پہ دیا رکھا گیا ہے

سروں کے تاج تھے اشفاق ہم تو
مگر اب زیرِ پا رکھا گیا ہے

محمد اشفاق بیگ

غزلیں

دل کی تلخی بیاں نہیں ہوتی
جیسے منہ میں زباں نہیں ہوتی

'یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے'
کیوں طبیعت رواں نہیں ہوتی

رنج سہنے کے ہو گئے خوگر
کوئی تلخی گراں نہیں ہوتی

ان کی صورت کا تذکرہ کیا ہے
ان کی صورت کہاں نہیں ہوتی

کس کو روکوں کسے کہوں جا کر
بات اپنی کہاں نہیں ہوتی

کیوں یہ رسوائیاں مقدر ہیں
یہ حقیقت بیاں نہیں ہوتی

روز ثقلین سینکڑوں غم ہیں
کچھ حقیقت عیاں نہیں ہوتی

سوگواری سی سوگواری ہے
بس یہ برسات مجھ پہ بھاری ہے

کیا بتاؤں بھلا زمانے کو
روح میں کیسی اشکباری ہے

خالی دیوار پر ہیں سب حیران
اس کی تصویر کیوں اتاری ہے

جب سے چھوڑا ہے وہ نگر میں نے
اِک سفر ہے جو اب بھی جاری ہے

رات مزدور نے کہا مجھ سے
بھوک کے ساتھ میری یاری ہے

سب کو ثقلین مسکرا کے کہو
میرا نقصان کاروباری ہے

ثقلین جعفری

غزل

کئی برسوں سے ویراں ہر چمن ہے
کسے اب خواہشِ برگ و سمن ہے

کوئی کارِ دگر، آتا نہیں تھا
اثاثے میں فقط شعر و سخن ہے

تمہارے پاس پہنچا ہوں اگر میں
یقیں کیجیے یہ صدیوں کا جتن ہے

نیا کوئی سفر کیسے کروں میں
ابھی تک پچھلی وحشت کی تھکن ہے

نکلنا پڑ گیا ہے تیرے دل سے
کہ اس زندان میں یکسر گھٹن ہے

ابھی اخلاص کی دولت ہے باقی
اگرچہ وقت جتنا پرفتن ہے

ازل کے روز سے اب تک جہاں میں
کوئی ڈھونڈو جو مجھ سا بے وطن ہے

خطاؤں کے سبھی پتلے ہیں جامی
مرا عیب سے کس کا تخن ہے

مستحسن جامی

غزل

ٹوٹا ہوا دل جوڑ ، محبت کی دعا لے
دوڑے چلے آئیں گے تری سمت اجالے

ہر روز نئی آس ، نیا عشق ، نیا خواب
اب کون بھلا ایک ہی چاہت کو سنبھالے

اب ملتے ہوئے رکھتا ہوں محتاط رویہ
وہ پھر سے کہیں کوئی توقع نہ لگالے

سوچا ہے کوئی بات بھی اس سے نہ چھپاؤں
ممکن ہے یہی بات مرا عشق بچالے

کوئی تو مجھے درد کا احساس دلاکر
بے کار میں ہنسنے کی اذیت سے نکالے

آنسو کا نکلنا ہے کہ خوں نکلے جگر سے
موزوں نہیں اس کے لیے بارش کے حوالے

محمد آصف انصاری

غزل

ایسا دھوپ بھرا رستہ ہے
سورج نے سایہ بھیجا ہے

پہلا پیار ہے پہلی بارش
اور اطراف میں تیز ہوا ہے

ساحل پر اب تنہا میں ہوں
سورج کب کا ڈوب چکا ہے

چاند کی اوٹ میں چھپنے والے
میں نے تجھ کو دیکھ لیا ہے

دیوار و در کانپ رہے ہیں
صحن میں وہ کہرام مچا ہے

صحرا میں اب آگ لگے گی
ذرہ ذرہ سلگ رہا ہے

خواب نہیں جب خواب ہمارے
تعبیروں میں کیا رکھا ہے

شہر کے دروازوں میں عاصم
کس کے آنے کا چرچا ہے

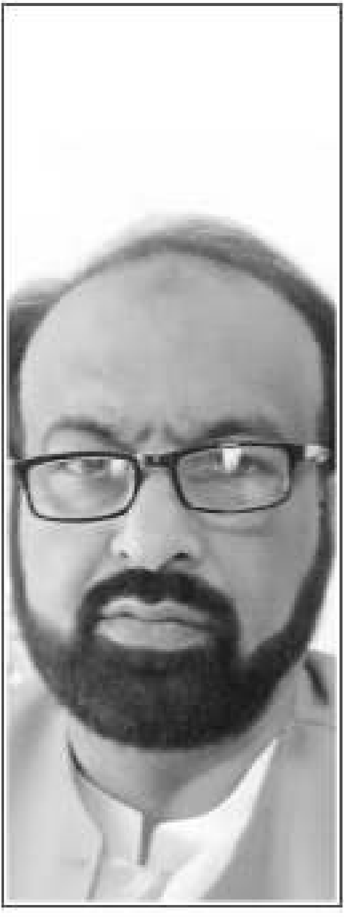

عاصم اعجاز

غزل

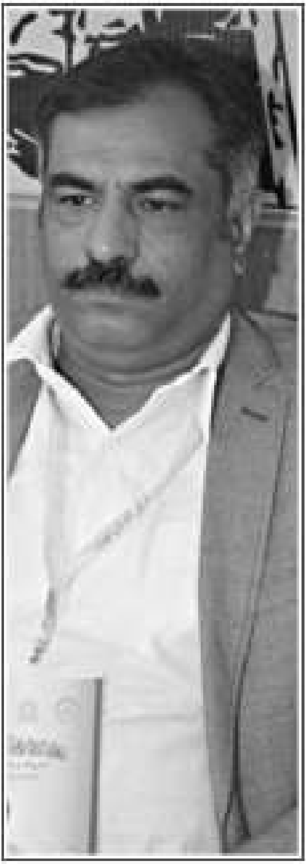

اصغر علی بلوچ

ایک سا خوف ایک سا خدشہ
کوئی چھوٹا کوئی بڑا خدشہ

چارسُو دشت میں ہے پھیلا ہوا
وسوسہ ، وہم اور گھنا خدشہ

پاؤں منزل کی سمت کیا بڑھتے
میرے چاروں طرف رہا خدشہ

میں نے محفوظ کر لیا دل میں
طاقِ ادراک پہ دھرا خدشہ

تیرے ہوتے ہوئے نہ تھی الجھن
تیرے ہوتے ہوئے نہ تھا خدشہ

تم نہیں تھے تو رات دن اصغر
راستوں میں رہا کھڑا خدشہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھنا یہ ہے کہ ہم کیوں سرِ کہسار آئے
قد بڑھانے اگر آئے ہیں تو بے کار آئے

غزل

رضا اللہ حیدر

خلش ہر لحظہ رہتی تھی خفا ہونا ہی بہتر تھا
ہوئے حالات ہی ایسے جدا ہونا ہی بہتر تھا

پیمبر کا سرِ کوہِ صفا ہونا ہی بہتر تھا
کہ ناحق اور حق کا فیصلہ ہونا ہی بہتر تھا

وہاں رستہ نہ تھا کوئی بہت اونچی فصیلیں تھیں
مرے ہر لفظ کا وقفِ دعا ہونا ہی بہتر تھا

وہ لطفِ دید شانِ دستگیری تو رہا اپنا
یوں بربادی کا پھر گھر میں بپا ہونا ہی بہتر تھا

ہمیں رسوا کیا ہے کج کلاہی کی تمنا نے
وگرنہ اک فقیرِ بے نوا ہونا ہی بہتر تھا

کیا تھا کام صیادوں کا خود ہی باغبانوں نے
ترا اس وقت گلشن میں صبا ہونا ہی بہتر تھا

محبت میں ہوں پیروکار علم الدین غازی کا
مرا ناموسِ احمدؐ پر فدا ہونا ہی بہتر تھا

جگر خوں ہوگیا اپنا گل و گلشن کی تزئیں میں
چڑھا تھا قرض نسلوں کا ادا ہونا ہی بہتر تھا

نہ جانے کس جگہ، کس طور، مائل ہو مری جانب
سفر میں ساتھ ساتھ اس کے رضا ہونا ہی بہتر تھا

غزل

عاصم بخاری

ہو گیا ہے شکار ، وہ اپنا
کھو چکا ہے وقار، وہ اپنا

جن کی تکریم لازمی سب پہ
ان میں کرتا شمار ، وہ اپنا

اس کی خوبی ہے سب سے رکھتا ہے
رابطہ استوار ، وہ اپنا

رکھ رکھاؤ کہ پہلے دن سے ہی
رکھتا ہے برقرار ، وہ اپنا

اس کو گلیوں میں ڈھونڈتا پھرتا
لے کے دل بےقرار، وہ اپنا

اس کو شہرت کی کیا ضرورت ہے
آپ ہے اشتہار ، وہ اپنا

لفظ نفرت سے وہ ، کہ ناواقف
یوں دکھاتا ہے پیار ، وہ اپنا

دنیا جو بھی کہے ، اسے عاصم
جیسا تیسا ہے یار ، وہ اپنا

غزل

جما ہے لوحِ افق پر ترا لہو کیسے
ہمارا چاک گریباں ہو رفو کیسے؟

پلا رہا ہوں اسے آبِ عارضِ جاناں
ہوئی ہے شاخِ ہنر میری مشکبو کیسے

تخیلات پہ ہے سائبان فکرِ میر
رہے گی شاخِ سخن میری بے نمو کیسے؟

عجیب الجھنوں کی کشمکش میں الجھے ہیں
کریں گے چہرۂ حالات خوبرو کیسے

کہ دور دور تلک ملنے کے نہیں آثار
رکھوں سنبھال کے دل میں یہ آرزو کیسے

نہ وہ درخت رہا نے وہ شاخ باقی رہی
کلام کرتی پرندوں سے آب جو کیسے؟

گواہی دے رہے ہیں میرے مضمحل خدوخال
کہ چاٹ چاٹ گئی تیری جستجو کیسے؟

ضرور تلخیء ایام کی عنایت ہے
شگفتہ شخص بنا پل میں تندخو کیسے؟

تمام عمر پیا جس نے زہر نفرت کا
وہ کرتا حضرتِ انساں کی آبرو کیسے؟

عجیب زبان تھی مظہر وہ خامشی کی زباں
وہ [illegible] ل [illegible] ل میں ہو

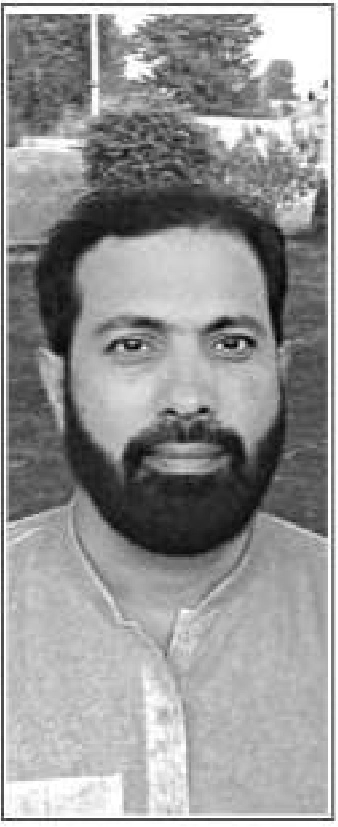

مظہر حسین مظہر

غزل

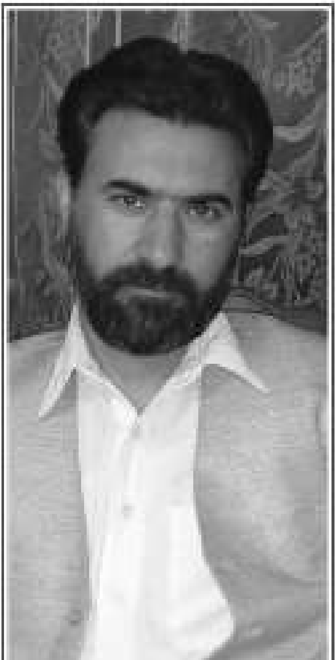

باتوں باتوں میں وہ بگڑ گئے ہیں
بس اکڑفوں ہے کہ اکڑ گئے ہیں

محفلیں گرم ہو گئیں ہیں سرد
یار جتنے تھے سب بچھڑ گئے ہیں

حالتِ زار دل کی دیکھ سہی
عاشقوں کی طرح اُجڑ گئے ہیں

کام دنیا سے کیا ہمیں تھا عبث
ہاتھ اپنے یونہی لتھڑ گئے ہیں

اَہم اتنے ہوئے ہیں اُن کے لیے
بازوؤں میں ہمیں جکڑ گئے ہیں

اب رفو کی نہیں رہی حاجت
بخیے دل کے مرے اُدھڑ گئے ہیں

عشق میں اس طرح ڈھلائے گئے
کھلتے عارض مرے سکڑ گئے ہیں

سرفراز عارض

غزل

بشیر احمد حبیب

میری ساری زندگی کی بے کلی ہے اک طرف
بے سبب سی بات پر اس کی ہنسی ہے اک طرف

دیکھ تو سکتا ہوں اس کو چھو نہیں سکتا مگر
اک طرف میرا جنوں ہے، بے بسی ہے اک طرف

میری ساری گفتگو اور اس کے وہ خاموش لب
سب دلیلیں اک طرف اور خامشی ہے اک طرف

فرق بس اتنا ہی ہے اک دوسرے کی چاہ میں
اک طرف ہے دل لگی، دل کی لگی ہے اک طرف

گو کہ میں خود ہی کھڑا ہوں آئنے کے سامنے
اک طرف حیرانی ہے، بیگانگی ہے اک طرف

محفلوں کی جان ہو، شاعر مگر اچھے نہیں
نغمگی ہے اک طرف اور شاعری ہے اک طرف

سوچ لو اچھی طرح پیارے بشیر احمد حبیب!
اک طرف ہے عاشقی اور زندگی ہے اک طرف

غزلیں

اک پیڑ کے آگے، میں کھڑا دیکھ رہا ہوں
ہر شاخ پہ پھیلی ہے وبا، دیکھ رہا ہوں

احساس سے خالی تری بستی میں بسے ایک
درویش کے ہونٹوں پہ صدا دیکھ رہا ہوں

جس شخص نے لکھی تھی محبت کی کہانی
اس شخص کو ملتی ہے سزا، دیکھ رہا ہوں

ہر جسم سے ہے دور، شریعت کی گزرگاہ
ہر روح کے پہلو میں خدا دیکھ رہا ہوں

میں وار گیا ہوں، دلِ نادان تجھے اور
دلدار کی آنکھوں میں انا دیکھ رہا ہوں

انسان کی خواہش پہ، تو چھائی ہیں بہاریں
دنیا کو خزاؤں میں فنا دیکھ رہا ہوں

ہے کارِ عبث شمس یہاں زیست کی چاہت
کہ درد کو ہر روز سوا دیکھ رہا ہوں

آفتاب محمود شمس

تیرے چہرے پہ گلوں جیسا وقار آ جائے
ہر کلی پر تری خوشبو سے نکھار آ جائے

ہم وہ انساں ہیں جو اجناس کی منڈی سے ملیں
جانے کس سمت سے بکنے کی پکار آ جائے

دھوکا کھاتی ہے ترے نام سے گلشن کی ہوا
ترے آنے سے گلستاں میں بہار آ جائے

کیا غضب کی ترے پیکر میں کرامت ہے کہ دوست
نام بیمار جو لے تیرا قرار آ جائے

دوستوں نے تو مری موت کا سامان کیا
دشمنِ جاں کو کہیں مجھ پہ نہ پیار آ جائے

شہر والوں کے یہ مے خانے بہت خوب مگر
گاؤں کی تازہ ہوا سے بھی خمار آ جائے

مجھ کو بس خوف سا رہتا ہے یہی جانِ شہاب
نام تیرے نہ ستاروں کا شمار آ جائے

شہاب اللہ شہاب

غزل

اندیشے نہ بوجھ بناؤ ، چلتے جاؤ
اپنی دھن میں قدم اٹھاؤ، چلتے جاؤ

رستے کی یہ دھول اور مٹی بھی مرہم ہے
بھر جائیں گے خود ہی گھاؤ، چلتے جاؤ

جنگل میں اس حال میں رکنا جاں لیوا ہے
تھک بھی جاؤ، مت ستاؤ، چلتے جاؤ

کمزوروں کا بوجھ بھی بانٹو، تم آپس میں
ان کا بھی کچھ ہاتھ بٹاؤ، چلتے جاؤ

قدموں کی آواز کو بھی تم ساز ہی سمجھو
گیت ملن کے گاتے جاؤ، چلتے جاؤ

چاروں جانب اس نے پَر پھیلا رکھے ہیں
دیکھو دھرتی کا پھیلاؤ ، چلتے جاؤ

آصف اب تم تعبیروں کی کھوج میں نکلو
سپنوں کو اب آگ لگاؤ ، چلتے جاؤ

یاسر رضا آصف

غزل

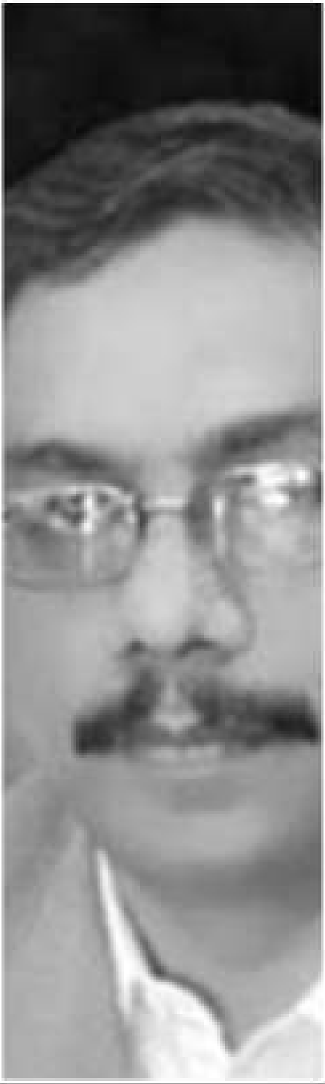

اظہر کمال

ہمیں خبر ہے کہ کیسے کسان بھرتا ہے
وہ اپنے خونِ جگر سے لگان بھرتا ہے

یہاں تو پیٹ بھی اپنے جوان بیٹوں کا
کہیں ضعیف، کہیں ناتوان بھرتا ہے

ستم ہے یہ جسے دیکھے سے دم نکلتا ہے
اسی کا دم یہاں سارا جہان بھرتا ہے

تو روز کس لیے ہوتا ہے یوں خفا ہم سے
یہ کون آ کے ترے روز کان بھرتا ہے

ترا دلاسہ غنیمت سہی، مگر اے دوست!
سفر کا زخم کہاں سائبان بھرتا ہے

نصیب اس کا ٹھہرتی ہے بے پروبالی
جو ناسمجھ یہاں اونچی اڑان بھرتا ہے

کہیں یہ میر کے دیوان کا اثر تو نہیں
یہ سسکیاں سی جو سارا مکان بھرتا ہے

غزل

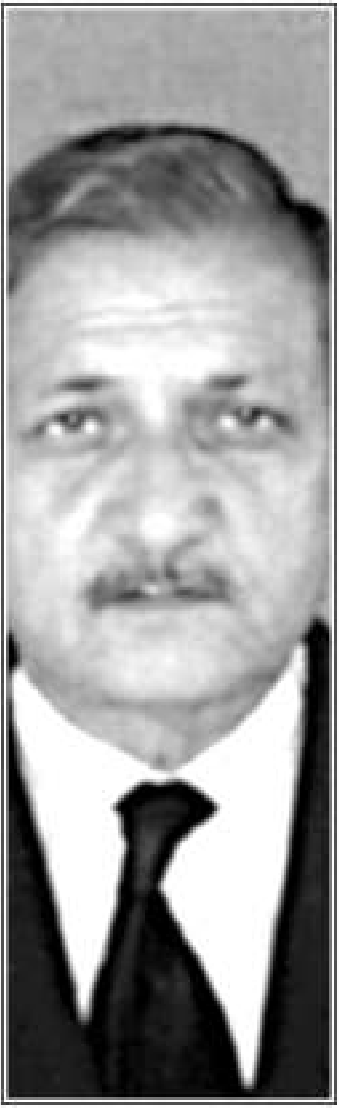

دنیا میں بس رہے ہیں جو یہ لامکاں کے لوگ
جنت کو جانے والے ہیں اِس کارواں کے لوگ

ذاتی مفاد کے لیے بیچیں اثاثے جو
ہم کو بتا کے چھوڑیں گے وہ داستاں کے لوگ

جمہوریت پھنسا گئی ہے ان کے درمیاں
مالک ہمارے بن گئے دو خانداں کے لوگ

مسجد بنا کے بیٹھے ہیں ڈیڑھ اینٹ کی سبھی
عِلمُ الفساد میں تو ہیں ماہر یہاں کے لوگ

بادِ بہاری نے کہا سُوکھے گلاب سے
کتنے ہی خود غرض ہیں ترے گلستاں کے لوگ

میرے ہیں غم گسار تو ہمدرد آپ کے
"ہوتے ہیں فتنہ ساز یہی درمیاں کے لوگ"

سالک ادیب کی یہاں اوقات کچھ نہیں
عزت انہی کی ہے کہ جو ہیں حکمراں کے لوگ

مجید سالک

غزل

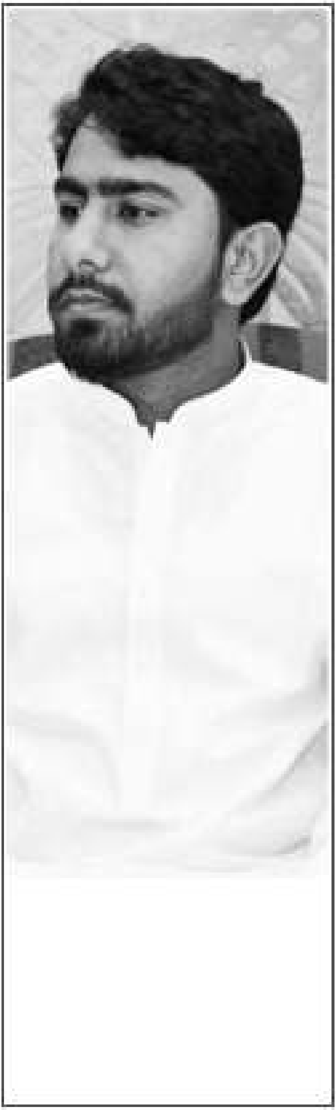

ہر چیز پیار میں ہے نئی ، مسئلہ نہیں
سب ٹھیک چل رہا ہے ابھی مسئلہ نہیں

کب تک رہیں گے ٹھیک یہ سارے معاملات
ہاں ٹھیک ہے کہ اب تو کوئی مسئلہ نہیں

اس عاشقی میں اور بھی ہیں مسئلے بہت
جو تو سمجھ رہا ہے وُہی مسئلہ نہیں

میں بھی کسی کو چھوڑ کے آیا تھا اس کے پاس
مجھ کو اگر وہ چھوڑ گئی ، مسئلہ نہیں

میں تیرا انتظار کروں گا تمام عمر
یہ دن مہینے سال صدی مسئلہ نہیں

یہ چیز دیکھنی ہے کہ اب کس کے ساتھ ہے
وہ پہلے جس کے ساتھ رہی مسئلہ نہیں

میں جس کے ساتھ ہوں وہ کوئی اور چیز ہے
میرے لیے تو حور و پری مسئلہ نہیں

امتیاز انجم

غزل

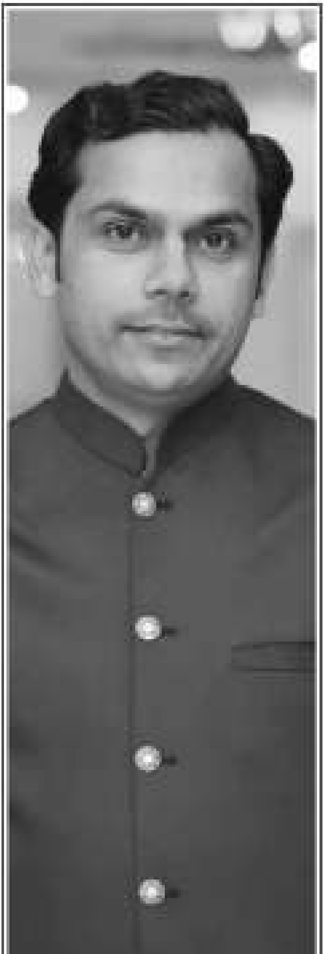

زبیر خیالی

دکھا کر بارہا اپنی جفاؤں کا تماشا
بنا بیٹھا ہے وہ میری وفاؤں کا تماشا

فریب ودام کی زد سے نکل آئے ہیں جاناں
کہ اب بے سود ہے ہم پر اداؤں کا تماشا

ذرا دیکھو تو کیسے کیسے منظر بن گئے ہیں
نہایت خوبصورت ہے گھٹاؤں کا تماشا

نہیں آلام کے حلقے سے نکلی زیست اب تک
ابھی کچھ اور باقی ہے بلاؤں کا تماشا

یہ پہنا لیتے ہیں باطل کو بھی حق کا لبادہ
بہت دیکھا ہے دنیاوی خداؤں کا تماشا

جہاں میں ہر کسی کو ہے عزیز اپنا ٹھکانا
بناؤ شہر میں رہ کر نہ گاؤں کا تماشا

کبھی خوشیوں کا مسکن تو کبھی غم کا خیالی
بشر کی زندگی ہے دھوپ چھاؤں کا تماشا

غزل

اندھی تو کسی کی بھی نہ تقلید کریں گے
حق بات کہو گے، تبھی تائید کریں گے

جھانکیں گے گریبان میں ہم اپنے ہی پہلے
پھر اور کسی شخص پہ تنقید کریں گے

اُس ایک خدا کو ہی خدا مانیں گے اپنا
اونچا یوں سدا پرچمِ توحید کریں گے

اُمید بھلائی کی کمینوں سے نہ رکھنا
مُحسن کی کبھی دید نہ بے دید کریں گے

ویسے تو نظر آتی نہیں کوئی کرن بھی
اِک روز سحر ہوگی یہ اُمید کریں گے

خواہش ہے کہ ہر چہرہ لگے چاند سا چہرہ
اِس دھرتی کے ہر ذرّے کو خورشید کریں گے

جس روز کھڑے ہوں گے کبھی پاؤں پہ اپنے
ہم لوگ حقیقت میں تبھی عید کریں گے

پیمان کریں گے تو نبھائیں گے سدا ہم
جاں دے کے بھی اُس عہد کی تجدید کریں گے

بولیں گے ضیاؔ! سوچ سمجھ کر ہی ہمیشہ
پھر اپنے بیانوں کی نہ تردید کریں گے

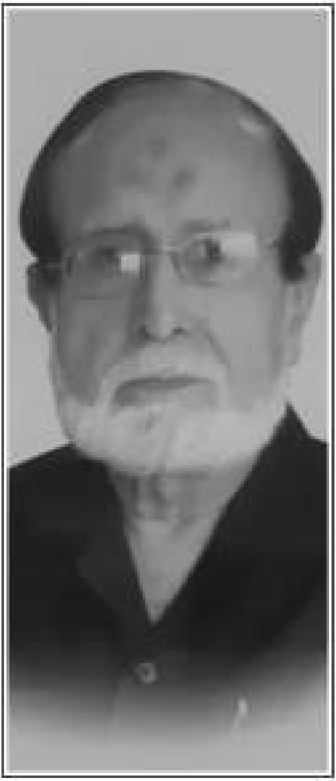

سید ضیا حسین

غزلیں

دیکھ کر روتا مجھے وہ ہنس پڑے
بات ہنسنے ہی کی تھی جو ہنس پڑے

نام آیا جب مرا تو شرم سے
اک ادا سے ڈھانپا منہ کو ہنس پڑے

یہ ارادہ تھا کہ رو لیں ہجر میں
دیکھ کر ہم آپ کو لو ہنس پڑے

ہاتھ میں خنجر لیے آتے تھے وہ
دیکھ کر پر نیم جاں کو ہنس پڑے

ایک دن یہ دن پھریں گے تھا یقیں
کل کے روتے آج ہم سو ہنس پڑے

خام ہیں شاید ابھی آہیں مری
حال دل سنتے ہوئے وہ ہنس پڑے

آپ کا تو شوق تھا رونا رضاؔ
خیر تو ہے آپ یوں جو ہنس پڑے

محمد اقبال رضا

سدھرنے کا نہیں امکان کوئی
ہمارے واسطے زندان کوئی؟

لہو میں خوف گردش کر رہا ہے
نہ پھٹ جائے کہیں شریان کوئی

در محبوب پر ساکت پڑا ہوں
کہ جاری ہو نیا فرمان کوئی

در و دیوار کی صورت نہ بدلی
کبھی آیا تھا اک مہمان کوئی

جہاں مکڑی نے جالے بن دیے ہیں
وہاں آباد تھا انسان کوئی

مرا دل باندھ لو گٹھڑی میں اپنی
ضروری پھر نہیں سامان کوئی

شاہد شوق

غزل

حسن اور اس کا فسوں آسودہ خاک
عشق اور اس کا جنوں آسودہ خاک

لذتِ شوقِ فزوں آسودہ خاک
دل کا وہ رقصِ جنوں آسودہ خاک

شاعری چارہ گری اور عاشقی
سب صفاتِ گوناگوں آسودہ خاک

آرزوئیں، حسرتیں، خواب و خیال
رنج و غم سوزِ دروں آسودہ خاک

خاک میں ہے مل گیا نخچیر زن
اور ہوا صیدِ زبوں آسودہ خاک

فلسفہ، منطق، سیاست، نفسیات
کب کہاں کس طرح کیوں آسودہ خاک

یا الٰہی قبر ہو جنت کا باغ
رحمتِ حق میں رہوں آسودہ خاک

اپنے مرقد کی لحد میں لیٹ کر
پھر سے جی اٹھنے کو ہوں آسودہ خاک

مغفرت کی آس میں یہ ناتواں
بندگی میں سرنگوں آسودہ خاک

لکھ دیا جائے محمد مصطفیٰ
کے غلاموں میں سے ہوں آسودہ خاک

سو رہے ہیں یاں جنابِ مظہری
مشتِ خاکِ بے سکوں آسودہ خاک

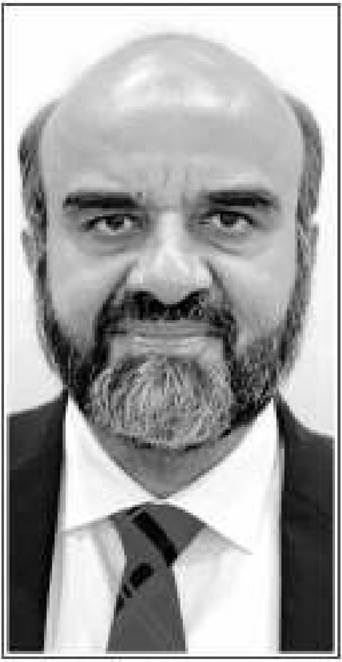

ضیاالمظہری

غزل

میں نے قسمت کو آزمایا تھا
وہ مری زندگی میں آیا تھا

میں نے اپنا سمجھ لیا تجھ کو
تو جو اپنا نہیں، پرایا تھا

اس کے دل میں تھا کوئی پہلے سے
جس کسی سے بھی دل لگایا تھا

ساتھ تیرے رہا جو برسوں سے
میں نہیں تھا، وہ میرا سایہ تھا

خواب میں اک خیال تھا شاید
اس نے جیسے گلے لگایا تھا

میرے آنگن میں پھول کھلتے گئے
وہ جو بھولے سے مسکرایا تھا

روشنی میں جو میرے ساتھ رہا
میں تھا، تُو تھا، یا میرا سایہ تھا

وہ تصور تھا یا کوئی تصویر
تیرے آنے پہ کون آیا تھا؟

وقت ساکت، مقام بھی ساکت
حسن نے معجزہ دکھایا تھا

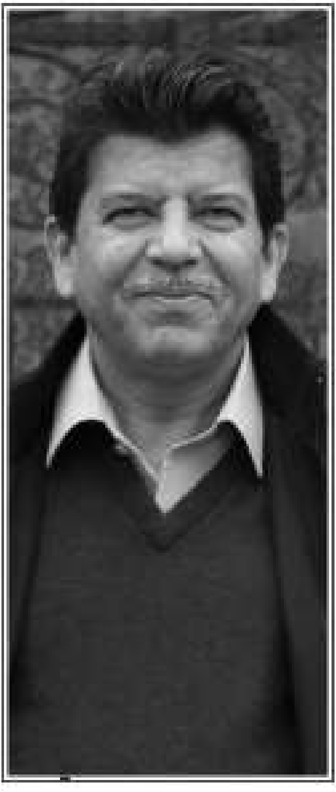

راجہ عبدالقیوم

غزل

سیاہ رات کی تائید کر کے دیکھتے ہیں
اک آفتاب پہ تنقید کر کے دیکھتے ہیں

وہ مان جائے یا انکار کر دے اس کا فعل
دیے کو جلنے کی تاکید کر کے دیکھتے ہیں

جو لکھ دیا تھا کسی نے ہماری قسمت میں
چلو ہم اس کو ہی تمہید کر کے دیکھتے ہیں

جو اس حیات کی سختی سے ٹوٹ جاتی ہے
اس ایک رسی کو تسدید کر کے دیکھتے ہیں

ہمیں یقین ہے کاٹے گا وہ ہمارے سر
سو اس کے حکم کی تردید کر کے دیکھتے ہیں

ہوا سے ڈرتا ہوا بجھ رہا تھا جو نعمان
اُسی چراغ کو خورشید کر کے دیکھتے ہیں

نعمان محمود

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

کس نے تری آنکھیں، مرے چہرے پہ سجا دیں
کس نے مرے آنسو تری پلکوں پہ جڑے ہیں

"ہیرِ فرحت شاہ" کا تنقیدی مطالعہ: روایت اور حال کے تناظر میں

'ہیر فرحت شاہ' کا مطالعہ کرتے ہوئے میں سوچ رہا ہوں کہ انسانوں کی طرح دنیا میں باقی سب تخلیقات بھی اپنا اپنا بخت لے کر پیدا ہوتی ہیں۔ واقعات اور اسباب کا بننا یا ٹوٹنا سب اسی بخت سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ بڑی تخلیقات اُتارنے کے لیے مناسب اور بڑے تخلیق کار کا چناؤ اور پھر اس کی تربیت کا اہتمام بھی خود فطرت ہی کرتی ہے۔ پنجاب میں لکھی جانے والی ہیر رانجھے کی داستان کے لیے وارث شاہ کا خوب صورت انتخاب میری اس بات کی دلیل ہے۔ ہیر وارث شاہ 1776 میں لکھی گئی اور محققین کی اکثریت کے مطابق اس کا پہلا ایڈیشن ہوپ پریس، لاہور سے ۱۸۵۶ میں شائع ہوا۔ اس کے بعد حامد شاہ عباسی، ہاشم شاہ، فضل شاہ گجراتی، کالی داس، علی حیدر، میاں محمد بخش، بھگوان سنگھ، دائم اقبال دائم، ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، مولا بخش کشتہ، جیسے کئی دوسرے بڑے شاعروں نے بھی یہ داستان تو لکھی لیکن وارث شاہ کی ہیر جیسا مقام و مرتبہ کسی اور کی تخلیق کے حصے میں نہیں آیا۔ میاں بخش جیسے قدآور شاعر کا یہ کہنا اسی عظمت کا اعتراف ہے کہ:

"وارث شاہ سخن دا وارث
نندے کون اونہاں نوں"

فرحت عباس شاہ اس عہد کے ایک بڑے تخلیق کار ہیں۔ ایک ایسے شاعر اور ادیب کہ وہ ادب کی جس بھی صنف کا انتخاب کریں، اپنے تخیل اور فکر کو جس بھی پیٹرن میں ڈھالنا چاہیں، اُن کے ہاں لفظ موم کی صورت پگھل کر قاری کی روح سے ایک غیر محسوس طریق سے اپنا تعلق جوڑ لیتے ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غزل، تنقید، نثری نظم، مکالماتی غزل، آزاد نظم، آزاد غزل اور ادب کی دوسری اصناف میں کم و بیش ۷۵ کتابوں کی

یونس خیال

اشاعت کے بعد انھیں وارث شاہ کی پیروی میں اپنی ہیر لکھنے کی ضرورت کیوں پڑی۔ کیا یہ محض ایک تجربہ ہے یا وارث شاہ کے انداز اور فلسفے سے ان کی نسبت ان کے طبعی رجحانات کے تابع ہے۔ میرے نزدیک اس کی تین بڑی وجوہات ہیں :

ا۔ وارث شاہ کا عہد مغلوں کے زوال، سکھوں کی شورشوں، نادر شاہ کے پنجاب پر حملے اور مقامی بدامنی کی وجہ سے قتل وغارت، فساد اور عوامی مسائل سے بھرپور نظر آتا ہے۔ اس کی لفظی تصویریں اُن کی ہیر میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ وجوہات مختلف ضرور ہیں لیکن تقریباً اڑھائی سو سال گزرنے کے باوجود اس خطے کے مسائل میں کوئی نمایاں تبدیلی نظر نہیں آسکی۔ فرحت عباس شاہ وارث کے دکھ میں نہ صرف شریک ہیں بلکہ عوام میں اس فضا سے نکلنے کا شعور تقسیم کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اس کا علاج ظرف والی ''جمہور'' تجویز کرتے ہیں:

ہوندی جے جمہور دے طرف آئی سارے جاندے نہ اُٹھی انسان ہیرے
مجرم بھیکھ وفائی دے بجاں دے اچھوں ہوندے نہیں شیطان ہیرے
بُنہ کدھ دن تانال جنہاں چوپا راہ اچھیاں وقتی راہوندے بے ایمان ہیرے
رہناں ایہاں دے اتھے بے مجبورناں گل ربس جے رہی انجان ہیرے

....

۲۔ معروف مارکسی مفکر پروفیسر ایرک سپرین نے وارث شاہ کو ایک ایسا باغی شاعر قرار دیا ہے جس نے بے انصاف اور پتھر دل معاشرے کے ظلم کو اپنے اسکندری غصے سے مارا۔ اس حوالے سے اگر فرحت عباس شاہ کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو ان کے ہاں جبر اور ناانصافی کے خلاف مسلسل جدوجہد کا رویہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ مزاحمت ان کے شاعری کا ایک مضبوط ترین استعارہ ہے۔ ان کا اہم شعری مجموعہ ''مزاحمت کریں گے ہم'' کو اس ضمن میں دلیل کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہاں ان کے یہ اشعار دیکھیے :

میں روز اٹھاتا ہوں کسی خواب کی میت
اور آپ یہ کہتے ہیں کہ ماتم نہ کروں میں

....

ہمارے جیسوں کی تقدیر بھی بدلتی نہیں
میں اب بھی پھرتا ہوں پچھلا جنم اٹھائے ہوئے

....

بعد آنکھوں کے مرا دل بھی نکالا اس نے
اس کو شک تھا کہ مجھے اب بھی نظر آتا ہے

....

جن معاشروں میں بغاوت پر اتنی کڑی سزا کا رواج پڑ جائے کہ قتل کرنے کے بعد باغی کی سامنے رکھی لاش پر بھی حاکموں کو اطمینان نہ ہو وہاں طبقاتی تقسیم کے رویے انتہا کو پہنچ جاتے ہیں۔ خوش حال معاشروں میں یہ تقسیم صرف امیر اور غریب کے طور پر کی جاتی ہے لیکن پست ذہنیت کے زیر اثر کچلے ہوئے مظلوم معاشروں میں طبقاتی تقسیم کے درجے یا ان

کی سطحیں اس سے مختلف اور زیادہ ہو جاتے ہیں۔ ایسے ماحول میں فرحت عباس شاہ کی ترجمانی کا ڈھنگ یقیناً منفرد اور دردناک ہے۔ وہ کھلی آنکھوں سے سیاسی اور معاشی حالات کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر اپنے قاری کو ان کی سنگینی سے آگاہ کرتے ہیں۔

بے حسی ، دروغ ، فروغ پایا
اتھے کھنگ تے اکھ مزاج بن گئے
چور چتر چلاک عظیم ہوئے
اتوں دل فریب رواج بن گئے
صوفی ، ملاں ، سیاسی دا فرق مُکیا ، داء
دم ، درود علاج بن گئے
ٹوٹے ہوئے سلوک ملوک سارے
اُتے تھلے ہزار سماج بن گئے

....

میم ملاں وچھیرو تے چڑھ بیٹھا نال بوری چار کے نُوہم کالے
کھیسے بھرے سُو پُوڈاں تے ڈالراں ٹل، کئے اکھو چاہوئے سُو کرم کالے
شہراں وچ گواہیاں دا قحط پیا ، بھاویں پیلکے لاشاں دے چم کالے
اپو وچ نمیں زلے لواب سارے کتے جائے مُسّا کاں دے کم کالے

....

۳۔ کسی بڑے فنکار کے ہاں اپنے جیسے دوسروں کو تسلیم کرنے کے انداز بھی بڑے ہوتے ہیں۔ فرحت عباس شاہ نے عظیم شعرا کی زمینوں میں اہتمام کے ساتھ شعر لکھ کر کھلے دل سے ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ یہ بات الگ کہ انھوں نے دوسروں کے خیالات اور فکر کی پیروی سے گریز کرتے ہوئے اپنے عہد کے مسائل کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ اس ضمن میں غالب اور اقبال کی زمینوں میں تسلسل سے لکھی غزلوں کی مثال دی جا سکتی ہے۔

یہ قوم صرف مفادات کی تلاش میں ہے
حساب سود و زیاں لا الہ الا اللہ

....

میرے جیسوں کا کیا بنے گا یہاں
اب اگر کوئی معجزہ نہ ہوا

....

ہیر فرحت شاہ جہاں اپنے عہد کا نوحہ ہے وہاں یہ صدق دل سے وارث شاہ کی عظمت کا شاعری طرف سے کھلا اعتراف بھی ہے۔ شاعر کا جھنگ سے تعلق ہونا بذاتِ خود ہیر سے وابستگی کی ایک وجہ ہے لیکن اس نے فرحت عباس شاہ نے محبت کی داستان کو طول دینے کے بجائے دنیا میں جنگ اور خون خرابے کے خلاف آواز اُٹھا کر امن و آشتی کا پیغام دیا ہے جو کہ ذاتی محبت سے بڑی محبت ہے۔

اکھاں دنیا تے امن تے ظلم ہووے، جتھے من دلی آزادی جنگ ہوئے
جتھے قتل قتال تے فخر ہوئے، اتوں فخر تے خون دا رنگ ہوئے
اتوں خبر لے کم دا کرن والی، پچھے خبر لے سب دا ڈنگ ہوئے
فرحت شاہ دی پکا ہے زلی مرا، بھاویں ہور ہوئے بھاویں جھنگ ہوئے

....

اوہی جنگ تاں کالی کرنی دی اے، بندے کُٹھیاں اتوں وی ہلکان ہوئے
مجھاں وڈ ڈالاں دی نسل وچوں شہریاں تکی کے شاہ دے خان ہوئے

یوروذا لارتے پنڈ دے گھول ہوندن، نکے ٹرن تے در ہم بوآن تھئے
جہاں گوز کرنی دی عہد کھیڈی ،روز نامی تے راز پریشان تھئے

....

میں نے ’’ہیر فرحت شاہ‘‘ کے باطن میں شعوری طور پر بھی جھانکا اور کوشش کی کہ فرحت عباس کی اپنی ’’بھاگ بھری‘‘ کو تلاش کروں اور اپنی اس دریافت پر آپ سب سے داد وصول کرسکوں لیکن میں مکمل طور پر کامیاب نہیں ہو پایا۔ البتہ کہیں کہیں راکھ تلے چھپی چنگاری کا شائبہ ضرور ہوا ہے۔

ہیر پچھیا جوگیا بھیڑیا وے، میرے دکھاں دا کوئی علاج دسیں
کویں وقت دی اگ نوں موڑ سکاں، میرے جراں دا کوئی خراج دسیں
کیوں فرحت دا پیار نہ بجھ سکی، کیوں ڈھاندہ سر دا تاج دسیا
ہن کلم اکلی دا کیہ جیسی، ہیتوں دنیا دے رسم رواج دسیں

....

ہیر آکھیا جوگیا سچ آکھیں ساڈا عشق ضروری رہ گیا اے
کدی من مرضی کجھ ہوندا سی جھدا تاں مجبوری رہ گیا اے
اہو مجنوں سو کھڑا نظر آیا جھوا کھاوندا چوری رہ گیا اے
جتھے جرماں انھیاں کر مارن اُتھے کیہڑا انوری رہ گیا اے

....

سیدھا ساہواں دی آری دی کات لئے، جہے جوداں تے ٹھیے تے ست دبے
گئے موت کنارے تے آن پہنچی، بوہا اجڑدا جے تے جھٹ ڈبے
ستاں ناں آیا دل پانئے تے، اہنوں لگے کرا جن وی گھٹ ڈبے
تیوں ادبے تے دوجی دا سمجھاوے، تیرے پچھاں رہ اُٹے جے بھٹ لبے

....

ایک شاعر ہیر لکھے اور اس میں اس کی اپنی محبت کا کھل کر بیان نہ ہو، بظاہر عجیب لگتا ہے لیکن یہ خامی ہی ہیر فرحت شاہ کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ شاعر نے اپنی ذات کے بدن سے دُکھ کا لباس اُتار کر کائنات میں بستی انسانیت کے دُکھ کی آفاقی چادر اُوڑھ رکھی ہے جس کا بظاہر کوئی رنگ نہیں ہوتا لیکن سب رنگ اسی سے پھوٹتے ہیں۔ سب رنگی، قوسِ قزح جیسی --- انسانیت کے دُکھ میں بھیگی چادر۔

ہیر آکھیا جوگیا دل کرداے جگ امن تے خیر دی خبر ہووے
ندے گھٹ ہوئے وُنی دو جیاں توں وڈی زہر ہووے ندائی زہر ہووے
ندی مائیاں تے کوئی جبر ہووے ندائی زور ظمیراں توں ہر ہووے
جتھے زکھ ہوون اُتھے گھر ہووے جتھے چپ ہووے اتھے قہر ہووے

....

وارث شاہ ۱۷۲۲ میں پیدا ہوئے اور ۱۷۸۹ میں فوت ہوئے۔ وہ سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشرتی حالات و واقعات کے نہ صرف مورخ ہیں بلکہ ایک بہت بڑے نفسیات دان کی طرح اپنے عہد کے باسیوں کی نبض پر ہاتھ رکھ کر ٹوٹتے سماج کا دکھ بیان کرنے کا فن بھی جانتے ہیں۔ اس عہد میں اگر اردو ادب کو دیکھا جائے تو مرزا محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد، میر تقی میر، نظیر اکبر آبادی، آتش کے علاوہ کئی اور بھی نامور شعرا سامنے آئے جن کی عظمت کا زمانہ آج بھی معترف ہے لیکن پھر بھی رام بابو سکسینہ کو کہنا پڑا کہ:
’’افسوس اردو زبان میں کوئی وارث شاہ

پیدا نہیں ہوا"

ہیر کی لے میں دُکھ کی ایک ایسی خاص کیفیت موجود ہے جس کی تاثیر پڑھنے سننے والوں کیا پنے زخموں کو بھی ہرا کر دیتی ہے۔ وارث شاہ کو اپنی اس اداسی اور دُکھ کا ادراک خود بھی تھا۔۔

"دنیا چھڈ اداسیاں پہن لیاں سید وارثوں ہُن وارث شاہ ہویا"

فرحت عباس شاہ کی اردو اور پنجابی شاعری میں بھی دکھ کی پرتیں موجود ہیں۔ اُن کے ہاں آج کے سماج کے دکھ نہ صرف دکھائی دیتے ہیں بلکہ سنائی بھی دیتے ہیں گویا اُنھوں نے وارث شاہ کی ہیر کی روایت کو مہارت سے آگے بڑھایا ہے۔۔

دم، دارو، دعاواں بے اثر ہویاں، گل ساری ویداں دے ہتھ آ گئی
ووٹے آکھیا کمن دے کنڈے گل، حال ان بے خداواں دے ہتھ آ گئی
پورے تے گئی چیر تے کٹی، بھوکھی بھجیاں بھراواں دے ہتھ آ گئی
پک روجھے توں کھوے لبھیا کہ ہتھوں نکل بلاواں دے ہتھ آ گئی

....

ہیر پچھدی جوگیا سچ دسیں، بھجڑے حاکم کیں وچھیا غلام تے سکن
بھجڑے نام نمیا ہوے اوہی اپنا کہ نمی بھجڑے حاکماں نے کھوے عوام تے سکن
کے بھوکے تے دکھنا تاں نمیا سارا، کچی دی کہاں کام تمام تے سکن
بھجوائی تیں سوہری آہا نے اکی سادی آن اسیہ دنا شام تے سکنا

....

ڈاکٹر صغرا صدف نے درست کہا ہے کہ "ہیر فرحت شاہ" میں ہیر کا کردار پنجاب کی ایک "سیانی عورت" کا ہے جو شاعر، جوگی، دوست اور دشمن، ہر رنگ کے اندر مکالماتی انداز میں دانائی اور حکمت تقسیم کرتی نظر آتی ہے"۔

مجھے "ہیر فرحت شاہ" میں ہیر کے طرز تخاطب نے بھی اپنی طرف خاص طور پر متوجہ کیا اور گاؤں کے پُرانے کلچر میں پرورش پانے والے مجھ جیسے قارئین ایک دانا اور محبت میں بھیگی عورت کے منہ سے نکلے مختلف حالات میں مختلف مکالموں کی شروعات کا یہ انداز بھول بھی کیسے سکتے ہیں۔ یہاں کچھ مثالیں پیش ہیں۔۔۔

"ہیر پچھدی جوگیا سچ دسیں"
"ہیر آکھیا جوگیا دل کروائے"
"ہیر آکھیا جوگیا جیوندیا وے"
"ہیر آکھیا جوگیا ویکھ لے وے"
"ہیر آکھیا جوگیا سوچ ذرا"
"ہیر آکھیا حق دی گل کریئے"

اور

"ہیر آکھیا جوگیا بھیڑیا وے"

....

ڈاکٹر صغرا صدف، ڈائریکٹر جنرل، پلاک نے اپنی سرپرستی میں پنجابی ادب کی ترویج اور ترقی کے لیے شاندار اقدامات کیے اور بہت عمدہ کتب شائع کراویں۔ "ہیر فرحت شاہ" کی اشاعت ان میں یقیناً ایک خوب صورت اضافہ ہے۔

☆☆☆☆☆

عارف فرہاد کی نظم نگاری

خاور اعجاز

تاریخی طور پر نظم کے ابتدائی دَور میں شاہ حاتم کی موضوعاتی نظموں کا سراغ مِلتا ہے جسے نظیر اکبر آبادی نے عوامی مسائل سے روشناس کرا کے نمائندہ شاعر ہونے کا اعزاز حاصل کِیا تاہم نئی اُردو نظم کے جو خدو خال محمد حسین آزاد اور مولانا حالی کی کوششوں سے ظاہر ہُوئے وہ ہیئت کے مختلف تجربوں سے گذرتے ہُوئے رومان پسندوں، ترقی پسندوں اور اہالیانِ حلقۂ اربابِ ذوق کے حوالے سے بہت نکھر کر سامنے آئے۔ زندگی کے جو بنیادی سماجی اور معاشرتی مسائل عرصۂ دراز سے شعرأ کی توجہ حاصل نہ کر سکے تھے اور غزل کے آہنگ میں نہ سما سکتے تھے اُنھیں اِن تحریکوں کے جید شعرأ نے نظم کے پیرائے میں ڈھال کر فرسودہ روایت سے نجات دھندگی کی صورت نکالنے کے ساتھ ساتھ عوامی جذبات کی ترجمانی کا فریضہ بھی ادا کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد صنعتی اور معاشرتی ڈھانچے میں تبدیلی سے نظم کے موضوعات میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہُوئیں اور عشق و محبت کے ہمراہ معاشرتی پیمانوں کو بھی اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کا رجحان نمایاں ہُوا۔

اِس پس منظر میں جب ہم عارف فرہاد کی نظموں کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے ہیئتی اعتبار سے پابند اور نثری نظم کی دونوں انتہاؤں سے گریز کرتے ہُوئے معرا اور آزاد نظم کا درمیانی راستہ اختیار کیا ہے۔ موضوعاتی سطح پر اُس کے ہاں جذبے اور ذاتی تجربے کو اہمیت حاصل ہے۔ وہ اِنھی دو ذرائع سے اپنے محسوسات دُوسروں تک منتقل کرتا ہے۔ ماضی قریب کی لسانی تشکیلات نے اُس کے مزاج میں دو ایک نظموں کی حد تک سرایت کی ہے جن میں وہ خیال کو لفظ کے وسیلے سے آگے بڑھاتا ہُوا نظر آتا ہے لیکن عمومی طور پر وہ اپنے رومانی رویّے کے باعث احمد فراز اور قتیل شفائی کی صف کا شاعر معلوم ہوتا ہے جس کے ہاں محبت کا دُکھ اُس کی ذات کے نہاں خانے سے ہوتا ہُوا خارج کے آئینہ خانوں میں منعکس ہو رہا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اُس نے بیرون کی وحشت اور تلخ حقائق کو جذب و انگیخت سے گذار کر درون کی محبت بھری فضا میں بسا لیا ہے۔ کہیں کہیں اُس نے رومان کے ساتھ ساتھ عصری تجربے پر بھی انحصار کیا ہے۔ ایسے مواقع پہ وہ بیک وقت ذات کی تلاش میں غوطہ زن اور حقیت کی دریافت میں محوِ پرواز نظر آتا ہے۔ یہ ایک مسلسل دو سمتی سفر ہے جس کی ایک سمت اُس کی شخصیت ہے اور دُوسری سمت آفاق کی

پہنائیاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی وہ اپنی ذات کے کسی کونے میں بیٹھا ہُوا نظر آتا ہے اور کبھی نادیدہ حقائق کے کھوج میں نکلے ہُوئے مسافر کے رُوپ میں۔ جب وہ اپنی ذات میں محو ہوتا ہے تو اُس کی نظم میں غنائی اور داخلی عناصر کی فراوانی نظر آتی ہے اور جب وہ آفاق کی حدوں میں گھوم رہا ہوتا ہے تو اُس کی علامتیں نسبتاً پیچیدہ ہو جاتی ہیں اور امیجری میں تہ داری آنے لگتی ہے۔

جدید نظم جس ارتکاز، ایجاز اور جامعیت کا تقاضا کرتی ہے وہ تمام نظم نگاروں پر واضح ہے۔ وضاحت، صراحت اور کسی منطقی تکمیلیت کو میں ذاتی طور پر نظم کی کمزوریاں تصور کرتا ہُوں۔ موضوع کی وسعت یا پھیلاؤ کتنا بھی کیوں نہ ہو اس کی شرح نظم کے تاثر کو یکسر زائل کر دیتی ہے۔ کہانی یا قصہ بھی جدید نظم کی روایت کا حصہ نہیں رہا کیونکہ یہ سب محض بیانیہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایک اچھا تخلیقی ذہن دُوسرے اذہان کے لیے جمالیاتی سوچ کا مواد مہیا کرتا ہے۔ اگر ایسا نہیں تو نظم کا بڑا موضوع بھی نظم میں تاثیر پیدا کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ عارف فرہاد کی نظموں کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ بعض مقامات پر حشو و زوائد آ جانے کے باوجود اُس کی نظم نہ تو بے جا طوالت کا شکار ہُوئی ہے اور نہ حساب کا سوال بن کر رہ گئی ہے۔ اُس نے زبان کی رمزیت کو حتی المقدور پیشِ نظر رکھا ہے اور مرکزی خیال کی کڑیوں کو ڈھیلا نہیں پڑنے دیا۔ اُس کی واردات جب مصرعوں میں ڈھلتی ہے تو ہمیں اپنی واردات لگنے لگتی ہے جسے اُس کی نظمیاتی سمجھ بوجھ کی کامیابی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک شعریت کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہُوں کہ اُس کی نظم اِس پیمانے کی بھی تشفی کر رہی ہے۔ اُس نے ایک مضمون کو مختلف انداز سے دہرا کر نظم نہیں بنائی بلکہ قدم بہ قدم آگے بڑھا کر قاری کو تخلیقِ نو کی منزل کی طرف جانے میں رہنمائی کی ہے۔

عارف فرہاد کی نظموں کا انفرادی جائزہ تو اس مختصر مطالعہ میں ممکن نہ ہو گا تاہم اُس کی نظموں کے قرأت کے دوران مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہُوئی کہ اُس کی بیشتر نظموں میں آنکھ کا ذکر بڑے تواتر سے آیا ہے۔

یہ ذات کہ اشک بن گئی تھی / اُس آنکھ کی بات کر نہ پائی / وہ آنکھ کہ جس میں ٹوٹے پھوٹے / کچھ خواب تھے، صرف خواب تیرے (خوابوں سے بھرے ہُوئے جہاں میں)

پھول چنتے چنتے ہی / ہجر کے دریچے سے / میری آنکھ اُلجھتی ہے (تتلیاں تخیل کی)

تجھ سے ہی رواں رواں تھا دل کا دریا تو ہی مری آنکھ کی چمک تھی (اے میرے نا سمجھ مسافر)

ایک دو خواب جو کہ تیرے تھے / آج تیری نظر بدلتے ہی / میری آنکھوں سے گر گئے شاید (خواب آنکھوں سے گر گئے شاید)

روتی ہُوئی آنکھ کے بدن سے / اشکوں کے صحیفے چننے والے / اب تو ہی بتا کہ

اس میں تو نے / کس حرف کو باوضو نہ دیکھا (اے شہرِ سخن کے شاہزادے)
بہار کے جب شگوفے مہکیں / مہکتے آنگن میں چڑیاں چہکیں / تو میری یادوں کے سارے جگنو / مری وفاؤں کے سب دھنک رنگ / تری ہی آنکھوں میں گھر بنائیں (نئے سال کی دعا)
یہ چاند اور سورج، یہ روشن ستارے / مری آنکھ کی / اس گھنی پیاس سے سب کے سب بے خبر ہیں (کیا گھنی پیاس ہے)
مَیں پت جھڑ دیکھ کر / بھیگی ہُوئی آنکھوں میں رخود کو زرد پتوں کی طرح / بکھرا ہُوا محسوس کرتا ہُوں (تمھیں جب یاد کرتا ہُوں)
غرضیکہ آنکھ ایک پہیلی کے طرح اُس کی نظموں میں لال پراندی، چنری اور کمخواب کا جوڑا پہنے بادل کے پنگھٹ پر ہوا کے کسی نو خیز جھونکے کی منتظر دکھائی دیتی ہے۔ ایسی پہیلی جس میں ہجر و وصال کے دُکھ سکھ رومان کی ایک بڑی لہر کے ساتھ دریائے محبت کے ایک کنارے سے دُوسرے کنارے تک پھیلے ہُوئے ہیں۔
رُومان کے علاوہ اُس کی نظم میں کئی دوسری زیریں لہریں بھی چل رہی ہیں جن میں کائنات، وقت، دُنیا اور خود اُس کی ذات کے متعدد پہلو منعکس ہو رہے ہیں۔ ایسی عمودی لہروں کی حامل نظموں میں 'عجب مجذوب صحرا ہے'، 'بساطِ کائنات کو مَیں کیا کروں' اور 'دستک' وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اِن نظموں میں کبھی وہ ساتویں در پہ بیٹھا مجذوب نظر آنے لگتا ہے جو آنے والی کل اِک نئی روشنی کے سفر پر نکل جانے کا منتظر ہے، کبھی سمندر کی آنکھ سے یاقوت و مرجان چنتا نظر آتا ہے اور کبھی جست بھر کر اپنے جہانِ ہست کی حد پار کرنے کا متمنی دکھائی دیتا ہے۔ اِس سلسلے میں اُس کی نظم ''کھنچتا ہے مجھے اک اور جہاں'' کی یہ لائنیں قابلِ غور ہے:
مَیں نے دیکھا ہے / کہ اس جوہرِ صد رنگ کی بینائی میں / لکھ رکھا ہے یہ کسی نے / کہ جہانِ موجود / رہِ تخلیقِ جہانِ نو میں / ایک دن زادِ سفر بننا ہے / اور یہ مرحلہ بھی مجھ کو ہی طے کرنا ہے
عارف فرہاد کی بعض نظموں میں بہت خوبصورت لائنیں، شاعری کی روح سے اُس کی گہری آشنائی کی خبر دیتی ہیں جیسے:
تجھ کو جو سنائی دے رہا ہے / یہ شور ہے گفتگو نہیں ہے (آنا ہے تو دل کے باغ میں آ)
ہَوا پھر سے گلابی پیرہن میں / رقص کرتی، پیار کے سُر گنگناتی / رات کے پچھلے پہر کھلتے ہُوئے پھولوں سے / شبنم کو چرا کر / بھیگی مٹی پر / نئے چہرے اگاتی جا رہی ہے (ہوا چہرے اگاتی ہے)
مجھے ذاتی طور پر اُس کی جن نظموں نے متاثر کیا ہے اُن میں 'ہمیں سورج سنہری کر رہا ہے'، 'زمیں بھی کرب سہتی ہے'، 'کھنچتا ہے

مجھے اِک اور جہاں' 'ہر آنسو میں آگ لگی تھی' 'کرب کا جنگل اُگ آیا ہے' اور 'محبت کچھ نہیں ہوتی' خاص طور سے شامل ہیں۔

موضوعاتی نظموں میں کشمیر کے موضوع پر ایک الگ حصہ اِس کتاب میں شامل ہے جو شاعر کی اِس خطۂ زمین کے ساتھ جذباتی وابستگی اور دلی محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اِس بین الاقوامی تناظر کے حامل موضوع کے علاوہ علاقائی اہمیت کے حامل موضوعات بھی اُس کی توجہ کا مرکز بنے ہیں جن میں آٹھ اکتوبر ۲۰۰۵ء کا قیامت خیز زلزلہ، پاک چین دوستی، حتیٰ کہ ایک تحقیقی مجلہ کا اجرا بھی اُس کی نظر سے اوجھل نہیں رہ سکا۔ اِن موضوعات سے شاعر کی دلچسپیوں اور وابستگیوں کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں اور اُس کے کثیر الجہاتی مطالعہ کا اعتراف کرنے میں بھی کوئی چیز مانع نہیں۔

زیرِ نظر مجموعہ کا آخری حصہ مختصر اصنافِ سخن یعنی ماہیا اور ہائیکو پر مشتمل ہے۔ میرے نزدیک اِن دونوں اصناف کی پہچان ان کی ہیئت سے زیادہ اِن کے مزاج سے ہونی چاہیے تاہم ماہیے کی حد تک عارف فرہاد نے اِس صنف کی معروف فارم استعمال کی ہے اور ہائیکو میں بھی ۵-۷-۵ کے ساتھ مساوی الاوزان ہائیکو تخلیق کی ہیں۔ اطمینان کی بات یہ ہے کہ اُس نے اِن دونوں اصناف کے ساتھ مزاج کے اعتبار سے تخلیقی انصاف کیا ہے۔ اُس کا ماہیا یا ہائیکو آپس میں ادغامی حد تک نہیں پہنچے کہ پڑھنے والے کو شبہ ہو وہ ماہیا پڑھ رہا ہے، ہائیکو یا پھر مختصر نظم۔ ذیل میں دیئے گئے عارف فرہاد کے مصرعے از خود اِس بحث کو سمیٹتے ہُوئے اس بات کا اظہار کردیں گے کہ اُن کا تعلق کس صنف سے ہے:

جب آنکھ چھلکتی ہے
دل کے آنگن میں
تری یاد سلگتی ہے

یہ تیری ہری آنکھیں
دل کو ستاتی ہیں
خوابوں سے بھری آنکھیں

اُس نے آنکھیں اُٹھا کے دیکھا تو
یوں لگا جیسے آسمانوں کو
مَیں نے کروٹ بدلتے دیکھا ہو

....

اگر کسی کو یہ بتانے کی ضرورت پڑے کہ پہلی چھ لائنیں دو ماہیے اور آخری تین لائنیں ہائیکو ہے تو مَیں معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ پھر اُس شخص کو اپنے مطالعے پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ مختصراً یہ کہ عارف فرہاد نظم کا مزاج دان اور رمز شناس ہے۔ نظم اُس کے دل میں دھڑکتی اور اُس کی رگوں میں سرخ خلیوں کی طرح دوڑتی ہے۔ اگر آپ نے زیرِ نظر مجموعے کی نظموں کو ٹھہر ٹھہر کر اور کڑی کڑی کھول کر نہیں پڑھا تو آپ اِس "زنجیر" کی جھنکار سے محروم رہ جائیں گے۔

☆☆☆☆☆

صفر کی توہین

''صفر کی توہین'' کے بنیادی موضوع پر اگر روایتی جدید انداز میں ناول لکھا جاتا تو زیادہ سے زیادہ یوں ہوتا کہ دو مختلف مذاہب کے کرداروں کی باہم شادی و ملاپ اور اس سے پیدا ہونے والے مذہبی، معاشی اور سیاسی مسائل کو اجاگر کیا جاتا۔ معاشرے میں پیدا ہونے والی مزاحمت اور منافرت پر بات ہوتی۔ قتل و غارت ہوتی اور ناول ختم ہو جاتا۔ مگر یہاں ایسا نہیں ہوا۔ اس موضوع پر اس انداز سے بہت کچھ لکھا اور فلمایا جا چکا ہے۔ یہاں جن کرداروں کا انتخاب کیا گیا ہے، مذہبی و معاشرتی تفریق اور سیاسی وجوہ کی بنیاد پر جب کرداروں کی کایا کلپ ہوتی ہے، ان کے باہمی ملاپ کے سبب ناول کی کہانی تیار کی گئی ہے جہاں بشیر اور مبشر (منکر اور نکیر) سوال کرنے کے لیے ایک شخص کے پاس پہنچتے ہیں۔

مرزا اطہر بیگ پاکستان کے معروف ناول نگار ہیں ان کا ناول 'صفر سے ایک تک--- سائبر منشی کی سرگزشت' 2010ء کے آگے پیچھے سانجھ پبلی کیشنز سے پہلی بار شائع ہوا تھا۔ اس ناول میں صفر اور ایک کے اعداد کہ جو کمپیوٹر کی بنیادی زبان ہے اور کمپیوٹر کے جتنے بھی پروگرام بنائے جاتے ہیں وہ اس پر ہی بنیاد رکھتے ہیں۔ کمپیوٹر کی زبان میں اسے Binary کہا جاتا ہے۔ مرزا اطہر بیگ نے کہانی کا آغاز 1970ء سے کیا ہے کہ جب ملک میں جاگیردارانہ نظام کو خطرات لاحق ہیں اور ایک جاگیردار اپنی جائداد اور کاروبار کو جدید بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے کمپیوٹر کا استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اس کا بیٹا ایک تحقیقی مضمون لکھنا چاہتا ہے، جس کی معاونت اس کا منشی کرتا ہے اور سائبر سپیس سے متعلق تمام ریکارڈ تلاش کر کے اسے مہیا کرتا ہے۔

اشعر نجمی کا ناول 'صفر کی توہین' پڑھنے کے بعد میرا دھیان مرزا اطہر بیگ کے ناول کی جانب چلا گیا اگرچہ اپنے موضوع، برتاؤ، تکنیک اور کرداروں کے حوالے سے ہر دو ناول میں کوئی مشابہت نہیں ہے۔ اشعر نجمی نے اپنے ناول ''صفر کی توہین' کے لیے کمپیوٹر سائنس پڑھانے والے ایک پروفیسر کے کردار کو مرکزی حیثیت دی ہے جو الگورتھم کی علامتی زبان پڑھ سکتا ہے اور مسائل کے حل کے لیے پروگرامنگ کر سکتا ہے۔ وہ ہندوستان کا پیدائشی ہے اور اس وقت ایمسٹرڈیم میں اپنی بیوی ریحانہ کے ساتھ مقیم ہے جس کا تعلق صومالیہ سے ہے۔ ناول کے آغاز میں

غافر شہزاد

بشیر اور مبشر (منکر اور نکیر) اس سے سوال پوچھتے ہیں کہ تمھارا رب کون ہے؟ جواب ملتا ہے: صفر- بشیر پوچھتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا کوئی رب نہیں؟ اور جب بشیر سے پوچھا جاتا ہے کہ تمھارا رب کون ہے؟ تو اس کے منھ سے نکلتا ہے: ایک- اب یہاں سے صفر اور ایک کی بحث کا آغاز ہوتا ہے- مبشر غرا کے کہتا ہے کہ تم خدا کی توہین کر رہے ہو- جواب ملتا ہے: میں 'صفر' کی توہین کیسے کر سکتا ہوں، وہی تو 'ایک' کو جنم دیتا ہے- یہاں صفر کو 'لامحدودیت' سے جوڑا جاتا ہے-

جب پوچھا جاتا ہے: تمھارا دین کون سا ہے؟ جواب ملتا ہے: الگورتھم- ان دو سوالوں اور ان کے جوابوں کے بعد، یوں سمجھ لیجیے کہ اس گفتگو میں ناول کے بنیادی اسٹرکچر کی بنیاد رکھ دی جاتی ہے اور ناول کی باقی کہانی اسی بحث کے تناظر میں آگے بڑھتی ہے- گلشن رائٹر کا کمال یہ ہے کہ کہیں بھی موضوع عملی زندگی سے قطع نہیں ہوتا اور کہیں بھی قاری اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا- کمپیوٹر سائنس کے پروفیسر کو کہیں نہ کہیں یہ کردار ملتے ہیں اور کہانی ایک خاص سمت میں کھلتی چلی جاتی ہے- کہانی مذہب، سائنس اور اتھیسٹ کرداروں کے گرد بنی گئی ہے-

معاشرہ جب تک روایت پسند اور محدود خطے میں پروان چڑھتا رہا ہے، عالمی ادب میں ناول کی کہانی روایتی انداز میں پیش کی جاتی رہی ہے- یہی وجہ ہے کہ تب تک انسان کا بنیادی مسئلہ 'شناخت' رہا ہے- جب صنعتی انقلاب کے بعد ذرائع آمد و رفت میں ریل گاڑی، سمندری اور ہوائی جہاز شامل ہو گئے تو دنیا کے ایک خطے کی مصنوعات دوسرے خطے میں جانے لگی تو یہ علاقائی شناخت ختم ہونے لگی- جدید ترقی یافتہ معاشرے نے انسانوں کے درمیان بین الثقافتی شراکت کے سبب ایک نئی طرز کی معاشرتی دنیا اور رشتوں کو جنم دیا، جو سمجھتی ہے کہ زمین پر پیدا ہونے والے مسائل کا حل بھی آسمانی یا الہامی نہیں، بل کہ زمینی ہی ہوگا- سائنس کی ایجادات نے حیات اور کائنات کے ساتھ ساتھ مذاہب کے بارے میں بھی سوالات اٹھانے شروع کر دیے- اب جس طرح کا معاشرہ اور اس کے کردار تشکیل پائے، اس نے مابعد جدید ناول کو جنم دیا ہے- 'صفر کی توہین' بھی اشعر نجمی کے ناول 'اس نے کہا تھا' کی طرح ایک مابعد جدید ناول ہے جسے معیاری عالمی ادب میں پورے اعتماد سے رکھا جا سکتا ہے-

ناول کا بنیادی کردار ایک دلت کردار ہے جو بعد میں اپنا نام بابو راؤ ناستک رکھ لیتا ہے اور اسی نام سے رجسٹر ہو جاتا ہے- پہلے دو ابواب میں اسی بنیادی کردار کی کہانی چلتی ہے جب کہ تیسرے باب میں ریحانہ کا کردار متعارف ہوتا ہے جس کا تعلق صومالیہ کے ایک مسلمان گھرانے سے ہے جو خود کو مدنی مسلم کہتے ہیں- ریحانہ کا گھرانہ سعودی عرب، ایتھوپیا سے ہو کر کینیا میں منتقل ہوتا ہے جس کے پیچھے سیاسی، مذہبی مسائل ہیں- زبردستی کی شادی کے چکر میں کینیڈا جانے کے بجائے فرار ہو کر ریحانہ جرمنی پہنچ جاتی ہے- آگے چل کر چوتھے باب میں رنجن کا

کردار ہے جس کی جنم بھومی بنارس ہے۔ وہ پینٹر ہے اور رنگوں کی زبان میں دنیا کو دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ وہ بنیادی کردار کا ایمسٹر ڈیم میں روم میٹ ہے۔ پانچویں باب میں آئزک کو کردار ہے جس کی ماں کیتھولک عیسائی ہے اور باپ یہودی ہے۔ دونوں اپنے بچوں کو مذہب سے اختیار کی آزادی دیتے ہیں۔ بچے کنفیوژن کا شکار ہو کر کچھ فیصلہ نہیں کر پاتے۔ جب وہ مذہب کا مذاق اڑاتے ہیں تو سکول والوں کے اصرار پر، ماں اور باپ ان کو اپنے اپنے مذہب کی جانب کھینچتے ہیں، ان میں ناچاقی ہو جاتی ہے اور وہ الگ ہو جاتے ہیں۔ باپ یہودی خاندان کی لڑکی سے دوسری شادی کر لیتا ہے۔ چھٹے باب میں بنیادی کردار جمیل ملک ہے جو ملتان کے ایک کٹر مذہبی خاندان میں پیدا ہوتا ہے۔ سکول اور مدرسے کی تعلیم حاصل کر کے بھاگ جاتا ہے اور اتھیسٹ بن جاتا ہے۔ اس باب میں مدرسے کی تعلیم کے مسائل اور بچوں کے ساتھ تشدد، جنسی بدفعلی اور مجرمانہ سلوک پر کھل کر بات کی گئی ہے۔ ساتویں باب میں مذاہب میں خداؤں کے تصور کے حوالے سے بات اس طرح انجام کو پہنچتی ہے: "ہم انسانوں نے خدا پر بہت ظلم کیا ہے۔ روز صبح سویرے ہم اپنی امیدیں، اپنی پریشانی، اپنی خواہشیں، اپنے توقعات کی طویل فہرست اسے پکڑا دیتے ہیں۔ اور وہ اکیلی جان اربوں کھربوں دعاؤں کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے"۔ یہاں ناول نگار کہتا ہے: "میرے دوست اور بھابی کی طویل کامیاب شادی نے مجھ پر یہ ثابت کیا ہے کہ محبت مذہب سے زیادہ طاقتور چیز ہے"۔

ناول کی تکنیک پر بات کی جائے تو یوں ہے کہ ناول بشیر اور مبشر (منکر اور نکیر) کے سوالات اور ناول کے بنیادی کردار کے طویل جوابات پر اساس رکھتا ہے، جس میں جب سے انسان نے جنم لیا ہے تبھی اہم مذاہب کی روشنی اور رہنمائی میں تشکیل پانے والے انسانی کرداروں کے بارے میں بات کی گئی ہے یہاں تک کہ جو مذہب نہیں بھی اختیار کرتا، اس کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ناول نگار نے دیباچے میں اقرار کیا ہے کہ اس نے "اصلی کردار اور اصلی واقعات کو تخیلی رنگ میں رنگ دیا ہے"۔

'صفر کی توہین' ایک نہایت حساس اور مشکل موضوع کا ناول ہے۔ اس میں ایک جانب کمپیوٹر سائنس کی بنیاد صفر اور ایک (بائنری) کو استعمال کرتے ہوئے صفر کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے اور اس کے لیے ریاضی دانوں اور فلسفیوں کے اقوال استعمال کیے گئے ہیں جو صفر کے وجود کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ ہر باب کے آغاز میں کوئی نہ کوئی ایسا قول تحریر کیا گیا ہے۔ جیسے: اگر صفر نہ ہو تو ایک بھی نہیں ہو سکتا... صفر کے بالکل قریب پہنچ کر زندگی، موت سے پہلے لامحدودیت کی طرف چھلانگ لگا دیتی ہے۔۔۔ صفر لاوجود نہیں ہے بلکہ یہ وجود اور لاوجود کے عین اتصال پر واقع ہے۔۔۔ جب آپ خود کو صفر کرتے ہو، اپنی طاقت کو ناقابلِ تسخیر بنا لیتے ہو۔۔۔ صرف ایک سمت ہے (نیچے)، صرف ایک رنگ ہے (سیاہ) اور صرف ایک عدد ہے (صفر)... ایک صفر بذاتِ خود کچھ نہیں لیکن اس کے بغیر آپ کوئی چیز شمار نہیں کر سکتے۔ صفر کچھ نہ کچھ ہوتے ہوئے بھی صفر ہی ہے۔

☆☆☆☆☆

حفیظ تائب اصولِ نعت کا سنگِ میل

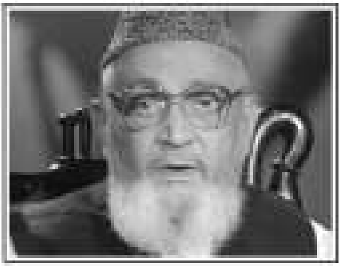

حفیظ تائب وہ نعت گو ہیں جن کے کلام نے نعت کو باقاعدہ ایک ادبی صنف کا درجہ دلایا۔ ان سے پہلے نعت کو عقیدے پر مبنی شاعری کے طور پر یا مذہبی موضوع کی شاعری تک محدود رکھا اور سمجھا جاتا تھا، جس طرح ان سے پہلے مذہبی موضوعات میں انیس نے مرثیے کو ایسی ہی رفعت عطا کی کہ اس کے بعد نہ صرف مرثیے کا ایک معیار طے کر دیا بلکہ مرثیے کی عظمت طے کر دی۔ انیس کے ہاں تشبیہات و استعارات کا وہ شکوہ نظر آتا ہے جو شاید ہی اردو کے کسی شاعر کو نصیب ہوا ہو۔ انیس کے بعد مذہبی یا عقیدے کی شاعری کو سرفرازی بخشنے کی دوسری مثال حفیظ تائب کی ہے جس میں کچھ سنگ ہائے میل طے ہوتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ عہدِ موجود میں کمرشلزم اور موقع پرستی کی وبا نے عشق، محبت اور عقیدت جیسے مقدس جذبات کو بھی مجروح کیا ہے لیکن حفیظ تائب جیسے صاحبانِ بصیرت اور مخلص تخلیق کار ادب کے گرد حفاظتی حصار بھی قائم کرتے نظر آتے ہیں۔

حفیظ تائب نے نعت کے جو معیارات سیٹ کیے ان میں پہلا معیار خلوص ہے، دوسرا احترام اور تیسرا عشق ہے۔ اگر ان تینوں میں سے کوئی ایک معیار یا اصول کمزور رہ جائے تو صنفِ نعت کا حق ادا نہیں ہو پاتا۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ہیئتی اعتبار سے نعت پر کوئی قید نہیں کہ وہ غزل کی فارم میں ہو یا نظم کی لیکن صنفی اعتبار میں فنی محاسن کے علاوہ اوپر بیان کیے گئے تین اصول یا پیمانے اس صنف کے درجے کے تعین میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ایک بہت ہی باریک نکتہ جو میرے مشاہدے میں آیا کہ حمد و نعت اور مرثیہ و سلام میں تخاطب کے حوالے سے اکثر شعرا حمد لکھتے ہوئے رب ذوالجلال کے حضور جب اس کے ایک بندے کے طور پر بے تکلفی یا شکوے کا پہلو لے کے آتے ہیں تو یہ معیوب اور گراں نہیں گزرتا بلکہ خدا اور بندے کے درمیان رشتے کی مضبوطی کی گواہی نظر آتا ہے لیکن نعت ہو یا سلام

فرحت عباس شاہ

نہ تو شکوہ کا محل ہے نہ بے تکلفی کی اجازت۔

حفیظ تائب کی نعت کو جب اس تناظر میں دیکھا جائے تو نہ صرف ہر معیار پہ پورا اترتی نظر آتی ہے بلکہ عمدہ و اعلیٰ مثال کے طور پر سامنے آتی ہے۔ حفیظ تائب نے خود اپنے کلام کے اندر نعت گوئی کے قواعد و ضوابط طے کر کے آنے والے زمانوں کے لیے اصولِ نعت وضع کر دیے۔ درج ذیل نعت دیکھیے۔۔۔

نعت گوئی کے لیے حسن ارادت شرط ہے
ساتھ کچھ فہم کتاب و علمِ سیرت شرط ہے

اس میں ہے لازم جمالِ فن بھی، اوجِ فکر بھی
جتنی ممکن ہو خیالوں کی طہارت شرط ہے

گر ادب پہلا قرینہ ہے ثنا کے شہر میں
ہر قدم اس راہ میں عجزِ طبیعت شرط ہے

اسوہ کا بھی نعت میں ابلاغ ہونا چاہیے
لیکن اس میں بھی لطافت اور حکمت شرط ہے

ہے محبت آپ کی ایمان کامل کی کلید
ہاں مگر جوشِ محبت میں اطاعت شرط ہے

ان کی تعلیمات میں مضمر ہے حسن زندگی
اُن سے بھرپور استفادہ بہر امت شرط ہے

سیرت پرنور تائب ہم کو دیتی ہے سبق
ہر قدم پہ احترام آدمیت شرط ہے

....

اگرچہ عشق کے معاملے میں انسان کے بے اختیار ہونے کے باعث شاعر کو رعایت مل سکتی ہے کیونکہ عاشق ہونا تو بہت ہی نصیب کی بات ہے کہ یہ درجہ کسی کو ملے یا نہ ملے لیکن نعت میں خلوص اور احترام پر کمپرومائز نہیں کیا جا سکتا۔ حفیظ تائب ان معدودے شعرا میں سے ہیں جنھیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ عشق رسول سے سرشار شاعر ہیں۔ ان کی شخصیت کمال کی نرمی اور کوملتا سے بھری ہوئی تھی۔ گفتار کی حلاوت تو کیا ہاتھ کا لمس دل کو چھو لینے کی طاقت رکھتا تھا۔ عشق رسولِ پاک صلعم کی روشنی ان کے چہرے سے مترشح تھا۔ یہی ادب آداب ان کی نعت کے خدوخال کو ترتیب دیتے ہیں۔

قدموں میں شہنشاہ دو عالم کے پڑا ہوں
میں ذرۂ ناچیز ہوں یا بختِ رسا ہوں

اب کون سی نعمت کی طلب حق سے کروں میں
دہلیز پہ سلطانِ مدینہ کی کھڑا ہوں

اس پیکرِ نوریں کو تصور میں بسا کر
میں روضۂ اطہر کی طرف دیکھ رہا ہوں

دامن مرا دھلوایا گیا عرفہ میں پہلے
پھر درگہِ سرکار میں بلوایا گیا ہوں

اے کاش ذرا دیر یہیں وقت ٹھہر جائے
میں پیشِ رسول عربی نعت سرا ہوں

....

اگرچہ حفیظ تائب نے بطور شاعر آغاز تو غزل سے کیا لیکن پھر نعت ہی ان کا اوڑھنا بچھونا رہی اور رب تعالیٰ نے اپنے محبوب کی ثنا کے صدقے ان کو جس عزت و توقیر سے نوازا وہ دائمی ہے کوئی ایک دو زمانوں کی بات نہیں۔

☆☆☆☆☆

نام ور ادیبہ حجاب امتیاز علی کا لکھا ہوا

جنگِ ستمبر کا 17 روزہ یادگار روزنامچہ ''موم بتی کے سامنے''

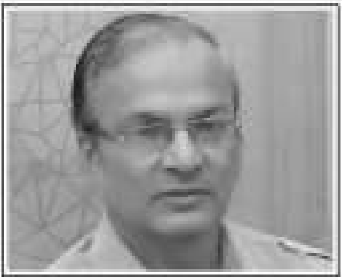

حجاب امتیاز علی کے لکھے ہوئے روزناچوں کے دو مجموعے چھپے۔ ایک ''موم بتی کے سامنے'' اور دوسرا ''لیل و نہار'' ان کا پہلا مجموعہ ''موم بتی کے سامنے'' پہلی بار آئینہ ادب لاہور نے 1976 میں چھاپا تھا۔ اس کے بعد یہ سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور نے چھاپا۔ سنگِ میل پبلی کیشنز نے یہ کتاب پہلے الگ کتاب کی صورت میں چھاپی بعد میں اسے نثرِ لطیف کے مجموعے ''صنوبر کے سائے'' میں شامل کر کے چھاپا۔ یہ 6 ستمبر 1965 کو شروع ہو کر 22 ستمبر 1965 کو ختم ہونے والی پاک بھارت جنگ کے دنوں کا روزنامچہ ہے۔ اس کا دیباچہ حجاب کے شوہر امتیاز علی تاج نے لکھا۔ یہ وہ جنگ ہے جس نے سارے پاکستان میں حب الوطنی کی روح پھونک دی تھی۔ سارا پاکستان متعصب اور بے اصول دشمن بھارت کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اپنی بہادر فوج کے شانہ بشانہ دشمن کے دانت کھٹے کرنے کے لیے بر سرِ محاذ ڈٹ گیا تھا۔ اس جنگ میں جہاں ہماری فوج نے دلیری، جرأت اور عزم و استحکام کی مثالیں قائم کیں، وہاں ہمارے ادیبوں شاعروں نے بھی اپنے محاذ پر خوب کام کیا۔ شاعروں نے قومی اور جنگی نغمے لکھ کر بہادر سپاہیوں کا خون گرمایا اور ہمارے گلوکاروں اور گلوکاراؤں نے ان نغموں کو اپنی آواز کا حسن، سوز اور درد عطا کر کے محاذوں پر ڈٹے ہوئے بہادروں کو گرمایا۔ ریڈیو پاکستان لاہور کا شعبۂ موسیقی بجائے خود ایک محاذِ جنگ بنا ہوا تھا۔ گلوکار، موسیقار اور شاعر ہر وقت موجود رہتے تھے تاکہ وطن کے لیے اپنے حصے کا کام کر سکیں۔ نثر نگاروں نے جنگ کے حوالے سے افسانے اور مضامین لکھے۔ صحافیوں نے اخبارات کے صفحات میں خون گرما دینے

ناصر بشیر

والی تحریریں لکھیں۔ حجاب امتیاز علی بھی جنگ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ وہ اگرچہ فطرت کی گود میں پلی تھیں اس لیے اُن کا اشہب قلم فطرت کے میدان میں خوب دوڑتا تھا لیکن وہ ایک رومانی ادیبہ تھیں۔ رومانی ادیب، بہادروں، شہ سواروں اور جاں نثاروں کے قصے بیان کر کے یک گونا تسکین محسوس کرتے ہیں۔ سو حجاب کو بھی اپنے ملک کی بہادر فوج پر پیار آیا۔ وطن سے محبت کا جذبہ جاگا اور انھوں نے ۶ ستمبر کو جنگ شروع ہوتے ہی روزنامچہ لکھنا شروع کیا۔ حجاب امتیاز علی کا جنگ کے دنوں کا روزنامچہ جہاں خود ان کے سارے تخلیقی کام میں الگ تھلگ، جداگانہ اور منفرد ہے وہاں یہ ادبی دنیا میں بھی ایک نیا کام ہے۔ روزنامچے کی کسی حد تک متعین ہیئت میں لکھا گیا یہ پہلا روزنامچہ ہے۔ اردو میں جنگ ستمبر کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا لیکن ''موم بتی کے سامنے'' جیسا روزنامچہ کسی نے نہیں لکھا۔ گویا کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب میں جنگ کے دنوں کا یہ پہلا روزنامچہ ہے اور ممکن ہے کہ آخری بھی ہو کیونکہ اب طویل روایتی جنگوں کا زمانہ چلا گیا ہے۔ ایسی جنگ ہوگی نہ ایسا روزنامچہ لکھا جائے گا۔

جنگ کے دنوں میں مکمل بلیک آوٹ ہوتا تھا۔ دشمن کے بمبار طیاروں کو اندھیرے میں رکھنے کے لیے گھروں، دفتروں اور کارخانوں کی ساری بتیاں بجھا دی جاتی تھیں اس لیے حجاب کی رومان پسند اور شاعرانہ طبیعت انھیں گھر کے ایک کونے میں لے جاتی، جہاں حجاب موم بتی جلاتیں اور روزنامچہ لکھنے بیٹھ جاتیں۔ اسی لیے اسے انھوں نے ''موم بتی کے سامنے'' کا عنوان دیا ہے۔

امتیاز علی تاج لکھتے ہیں:

''1965 کی جنگِ ہندو پاکستان کے زمانے میں ہر روز رات کو بلیک آوٹ کی جملہ ہدایات پر عمل پیرا ہونے کے باعث حجاب کے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اپنی دیرینہ عادت کے مطابق سونے سے پہلے اپنا روزنامچہ لکھیں تو موم بتی روشن کریں۔ اس مجبوری نے جنگ کے سترہ دنوں کے اس روزنامچے کو ''موم بتی کے سامنے'' کا بہت موزوں، دلچسپ اور لطیف نام بخش دیا۔ بلیک آوٹ کی اندھیری راتوں میں جب سائرن کئی کئی بار دشمن کے ہوائی جہازوں کی آمد کی اطلاع پہنچاتے رہتے تھے، کسی خاتون کا موم بتی کے سامنے بیٹھ کر باقاعدگی سے اپنا روزنامچہ لکھتے رہنا بڑی ہمت اور حوصلے کا کام تھا۔ یہ روزنامچہ ہر روز لکھا میرے سامنے جاتا تھا لیکن اسے پڑھنے کا موقع مجھے کبھی نہ ملا تھا''۔

جنگ کا یہ منفرد روزنامچہ کتابی صورت میں چھپنے سے پہلے اس زمانے کے موقر ادبی جریدے ''نقوش'' میں چھپا جس کے مدیر محمد طفیل تھے۔ محمد طفیل نے جنگ ختم ہونے کے بعد تمام ادیبوں کو خطوط لکھے جن میں

ان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ سب ان کے جریدے کی قلمی اعانت کریں۔ سو حجاب نے اپنا یہ روزنامچہ اپنے شوہر امتیاز علی تاج کو دکھایا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ یہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد تخلیق ہے، اس لیے یہ ''نقوش'' میں چھپنے کے لیے بھیج دیا گیا۔

امتیاز علی تاج نے یہ قصہ یوں بیان کیا ہے: ''جنگ ختم ہونے کے بعد مدیرِ نقوش نے حجاب کو خط میں لکھا کہ ہندوستان کے جو ادیب ان کے رسالے کے قلمی معاون تھے ان کے لیے جنگ کے بعد ''نقوش'' سے کم ازکم کچھ عرصے کے لیے قلمی اعانت کرنی چاہیے۔ مدیر 'نقوش' کو مضمون کی جلد ضرورت تھی چنانچہ حجاب کو ان کی فرمائش مقررہ وقت میں پوری کرنے کا خیال آیا کہ کیوں نہ اپنا جنگ کے دنوں کا روزنامچہ 'نقوش' کے لیے بھیج دیں۔

اسے نقل کرکے انھوں نے مجھے پڑھنے کے لیے دیا تو مجھے اس درجہ دلچسپ معلوم ہوا کہ میں اسے ختم کیے بغیر کسی طرح ہاتھ سے نہ رکھ سکا۔ اس روزنامچہ کی بے ساختگی اور روانی میں حجاب کے البیلے انداز نے ایسی دلآویزی اور گرفت پیدا کردی ہے کہ جو بھی اسے پڑھے گا میری رائے سے اتفاق کرے گا۔ اس کتاب کی طباعت کے بعض مراحل میں رسائل میں چھپا ہوا روزنامچہ جب بھی میری نظر سے گزرا میں پھر اسے پڑھتا چلا گیا اور ختم کرنے سے پہلے اپنی کسی دوسری مصروفیت کی طرف توجہ نہ کرسکا۔ اس روزنامچے سے متعلق اسی رائے کا اظہار ان خواتین و حضرات نے خطوط میں اور زبانی کیا جنھوں نے یہ روزنامچہ 'نقوش' میں پڑھا''۔

ادبی جریدے ''ساقی'' کے مدیر شاہد احمد دہلوی نے یہ روزنامچہ ''نقوش'' میں پڑھا تو انھیں بھی یہ بہت پسند آیا۔ وہ ان دنوں ''ساقی'' کا جنگ نمبر مرتب کرنے کی تیاریاں کررہے تھے۔ ہرچند کہ یہ ''نقوش'' میں چھپ چکا تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے یہ روزنامچہ ''ساقی'' کے جنگ نمبر میں شامل کیا۔ وہ ''ساقی'' کا اداریہ ''نگاہِ اوّلیں'' کے نام سے لکھتے تھے۔ جب ''ساقی'' کے جنگ نمبر میں یہ روزنامچہ چھپا تو اس کے بارے میں شاہد دہلوی نے لکھا:

''محترمہ حجاب امتیاز علی صاحبہ نے جنگ کے زمانے میں جو روزنامچہ لکھا تھا اس میں لاہور کی پوری روداد دلچسپ پیرائے میں آگئی ہے۔ ان کے منفرد انداز بیان نے اس روداد میں افسانوی دلکشی پیدا کردی ہے۔ یہ روزنامچہ روزانہ رات کو موم بتی کی روشنی میں لکھا گیا ہے مکمل بلیک آؤٹ میں جب دشمن کے طیارے بمباری کے لیے سر پر منڈلاتے رہے ہوں مستقل مزاجی سے کوئی یادگار چیز لکھ لینا بڑی دلیری کا کارنامہ ہے''۔

دو مشہور ادبی جریدوں میں چھپنے کے بعد 1976 میں یہ روزنامچہ لاہور کے طباعتی و اشاعتی ادارے ''آئینۂ ادب'' نے کتاب کی صورت میں چھاپا۔ یوں یہ تاریخی دستاویز

ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی۔ ادبی رسالوں کے جنگ نمبر زیادہ وقت گزر جانے کے بعد تلاش کرنا مشکل ہوتے ہیں شاید اسی سوچ کے پیش نظر اسے اسی زمانے میں کتابی صورت میں چھاپ دیا گیا تھا۔ اس کی کتابی صورت میں طباعت کے بارے میں امتیاز علی تاج نے لکھا ہے:

"ادارہ آئینہ ادب کے مہتمم جناب عبدالسلام صاحب نے اس روزنامچے کو پڑھا تو مصنفہ کو توجہ دلائی کہ 1965 کی ہندو پاکستان کی جنگ کے متعلق جو ادب پیدا ہوا، اس میں یہ روزنامچہ کئی اعتبار سے ایک تو اہم دستاویزی مقام رکھتا ہے۔ دوسرے اس لحاظ سے بھی وقیع ہے کہ اصناف ادب میں سے روزنامچہ کی صنف اردو میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ چنانچہ اسے کتابی صورت میں شائع ہو کر جنگ کے یادگار ادب میں شامل اور محفوظ ہو جانا چاہیے تاکہ اس کا تذکرہ سن کر پڑھنے والوں کو اسے حاصل کرنے کے لیے رسائل کے جنگ نمبروں کی تلاش نہ کرنی پڑے"۔

آئینہ ادب کے مہتمم جناب عبدالسلام نے درست فیصلہ کیا تھا۔ انھوں نے یہ روزنامچہ کتابی صورت میں چھاپ کر محفوظ کر دیا۔ یہ روزنامچہ ایک نادر اور نایاب شے ضرور ہے لیکن کتابی صورت میں یہ عام مل جاتا ہے۔

"موم کی ناک کے سامنے" میں 1965 کی جنگ کے سترہ دنوں کا احوال لکھا گیا ہے۔ سترہ دنوں کا احاطہ 23×36 سائز کے ستر صفحات میں کیا گیا ہے۔ 6 ستمبر 1965 سے 22 ستمبر 1965 تک مکمل روزنامچہ لکھا گیا ہے۔ عام طور پر روزنامچہ نگار کسی روز کچھ بھی نہیں لکھتا لیکن حجاب، جنگ کے دنوں میں اتنی سرشار اور جذباتی تھیں کہ بلیک آؤٹ کے باوجود انھوں نے یہ روزنامچہ کسی ناغے کے بغیر مسلسل لکھا۔ ایک اچھے روزنامچے کی طرح یہ تاریخ وار ہے۔ یوں یہ جنگ کے سترہ دنوں کی مکمل تاریخ بن گیا ہے۔ حتیٰ کہ اس میں انھوں نے بعض تاریخی حقائق بھی درج کر دیے ہیں۔ میجر عزیز بھٹی کی شہادت کا واقعہ بھی انھوں نے بیان کیا ہے۔ ایک رومانی ادیب بھلا بہادری، شجاعت اور جاں نثاری کے اس اہم واقعے سے کس طرح نظر چرا سکتا ہے۔ انھوں نے میجر عزیز بھٹی کی شہادت کو بھی رومان کی طرح پیش کیا ہے۔

حجاب امتیاز علی لکھتی ہیں:

"وہ نشانِ حیدر پانے والا پاکستان کا جیالا جاں نثار جو دشمن کی لاکھوں کی تعداد کی فوج کے آگے حفاظتی دیوار بن کے کھڑا ہو گیا۔ میجر عزیز بھٹی جو پرسوں لاہور کے محاذ پر شہید ہو گئے اور اپنے پیچھے حب الوطنی اور شجاعت کی ایک داستان چھوڑ گئے۔ ان کے خاندان کے سارے رکن قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی مثال ہیں۔ جب ان کی شہادت کی خبر، ان کے ضعیف والدین، کم سن بچوں اور ان کی جوان بیوہ کو ملی تو انھوں

نے اس سپاہی کے جام شہادت پینے پر سکون وصبر اور فخر کا اظہار کیا۔ ان کی ساس نے کہا کہ میرے داماد نے شہید ہو کر سینکڑوں پاکستانی عورتوں کا سہاگ قائم رکھا۔ فوجی اعزاز کا سب سے اعلیٰ تمغہ پانے والے شہید میجر عزیز بھٹی نے ہفتہ بھر بھوکا پیاسا رہ کر پاکستان کی حفاظت کی۔

اس سارے کارنامے میں ان کے پاس صرف ایک سٹین گن تھی۔ مگر مسلمان سپاہی کبھی ہتھیاروں کا محتاج نہیں ہوتا۔ ہتھیاروں کے انبار تو بھارتی فوج کے پاس لگے ہوئے ہیں۔ بغیر جذبے کے ہتھیار بچوں کا کھلونا بن کر رہ جاتے ہیں۔ 21 ستمبر کو پاکستان کا یہ مایہ ناز بہادر سپاہی دشمن کی ہزاروں کی تعداد میں پیدل فوج اور لاتعداد ٹینکوں اور توپوں کے گولوں کی برسات کا مقابلہ کر رہا تھا کہ ایک گولہ دائیں کندھے پر آ گرا اور نشانِ حیدر پانے والا شہید ہو گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے اور اس بات کی کئی اور جگہ سے تصدیق ہو چکی ہے کہ ہماری فوج کا ہر جوان خواہ وہ ہوا باز ہو، یا میدانی یا بحری سپاہی --- عزیز بھٹی ہے۔

میری موم بتی بجھتی جا رہی ہے مگر میرے قلم میں سیاہی بھری ہوئی ہے۔ کسی بم کے آ گرنے یا موم بتی کے بجھنے سے پیشتر میں اتنا کہنا چاہتی ہوں۔ پاکستان کے شیر دل مجاہدو! ہم پاکستان کی عورتیں --- جن کی عزت و ناموس کے تم محافظ ہو، تمھاری خدمت میں یہ ہدیہء سلام بھیجتی ہیں --- پاک افواج! زندہ باد"۔

اس جنگ نے دراصل حجاب امتیاز علی کے جذبہء حب الوطنی کو بھی جگا دیا تھا۔ اس سے قبل ان کی کسی تحریر میں اپنے وطن کی محبت اس طرح جاگزیں نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ یہ ایک سچ ہے کہ وہ جنوبی ہند کے علاقے میں پیدا ہوئیں۔ وہیں پلی بڑھیں۔ جوان ہوئیں۔ سنِ شعور تک پہنچیں۔ شادی کے بعد وہ پنجاب کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ ان کے اس روزنامچے سے کسی بھی جگہ اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ اپنے متروک وطن کی محبت میں گرفتار ہیں۔ حالانکہ ایک رومانی ادیبہ ہونے کے ناطے اگر وہ اپنے متروک وطن کو یاد بھی کرتیں تو اسے ان کی رومانیت پر محمول کیا جاتا لیکن انھوں نے ثابت کیا کہ انھیں اپنے وطن سے محبت تھی۔ وطن کے جوانوں سے بھی انھیں محبت تھی جو محاذِ جنگ پر دشمن کے حملے روک رہے تھے۔ وہ صرف میجر عزیز بھٹی جیسے جاں نثاروں کی محبت میں گرفتار نہ تھیں بلکہ اس زمانے میں پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی شخصیت سے بھی بے حد متاثر تھیں۔ اس روزنامچے میں انھوں نے محمد ایوب خان کا کئی مقامات پر ذکر کیا ہے۔ ایک رومانی ادیبہ ہونے کے باعث ان کی دبنگ شخصیت، پر رعب آواز اور دبدبے سے وہ بہت متاثر نظر آتی ہیں۔ بھارت نے شب خون مارا تو محمد ایوب خان نے قوم سے جو خطاب کیا تھا اس نے جہاں بہادر فوج اور پاکستانیوں کا خون گرمایا تھا وہاں اس

نے حجاب امتیاز علی کے خون کی گردش بھی تیز کر دی تھی۔ انھوں نے اپنا روزنامچہ کتابی شکل میں چھاپا تو دیباچے کے بعد ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ بطور خاص درج کیے۔

"میرے عزیز ہم وطنو! اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ رکھتے ہوئے ہم دشمن کی ان توپوں کو خاموش کر چکے ہیں جنھوں نے ہمارے وطن پر آگ برسانے کی جسارت کی تھی۔ آج ہر پاکستانی گھر میں قومی خدمت اور جوش وخروش کی شمع روشن ہے۔ اس کی روشنی سے وہ راستے جگمگا اٹھے ہیں جن پر پاکستانی عوام فرض کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھنے کو تیار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے ایمان واتحاد کی طاقتوں سے سرفراز کیا۔ اسی ایمان اور اتحاد نے ہماری زندگی کو ایک نئی روح عطا کی ہے جس جدوجہد کا ہمیں سامنا کرنا وہ ایک طویل جدوجہد ہے لیکن اللہ کی طرف سے آپ کو جو قوت ایمانی ملی ہوئی ہے وہی آپ کو اس جدوجہد میں کامیاب و بامراد بنانے کے لئے ہر طرح کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی وناصر ہو۔ آمین! پاکستان پائندہ باد"

یہی نہیں، انھوں نے مزید کئی مقامات پر ایوب خان کا ذکر کیا ہے۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے ان کے لہجے میں وہ وارفتگی آجاتی ہے جو کسی عاشق کے ہاں ہی دیکھی جا سکتی ہے۔ بے اصول اور متعصب دشمن بھارت کی جارحیت کا ذکر وہ واشگاف انداز میں کرتی ہیں۔

حجاب امتیاز علی لکھتی ہیں:

"پاکستان اور بھارت میں آج علی الصبح جنگ اچانک چھڑ گئی۔ ہم پاکستانی عوام نصف دن گزرنے تک بھارت کے اس اچانک حملے سے بے خبر رہے۔ ہر چند کہ جنگ کا خطرہ مسئلہ کشمیر کی وجہ سے دونوں ملکوں کو آج سے سترہ سال سے تھا۔ مگر ساری دنیا کا اور ہمارا اپنا خیال تھا کہ یہ جنگ اگر چھڑی تو دونوں ملکوں کی طرف سے باقاعدہ اعلانِ جنگ کے بعد چھڑے گی۔ لیکن بین الاقوامی اصول کے خلاف بھارتی فوج آج پچھلے پہر کے اندھیرے میں اپنے بھاری توپ خانے، سینکڑوں ٹینک اور بہت سے لڑاکا طیاروں کو لے کر ہماری مقدس سرحدوں میں چوروں طرح دبے پیروں اچانک گھس آئی۔ یہ حملہ اس نے لاہور پر بیک وقت تین طرف سے کیا اور اس کی فوجیں واہگہ، جسر اور بیدیاں کے پاکستانی علاقوں میں داخل ہو گئیں۔ بھارت کی یہ غیر اصولی حرکت ساری اصول پرست دنیا میں معیوب سمجھی جائے گی مگر بھارت کو یاد رکھنا چاہیے کہ پاکستان شیروں کا ملک ہے۔ مغربی پاکستان ہو یا مشرقی پاکستان، یہاں شیر بستے ہیں۔ چنانچہ پاکستان کی بری اور فضائی فوجیں چشم زدن میں تیار ہو گئیں اور موقع پر پہنچ کر دشمن کی لاتعداد فوجوں کو اپنی قومی روایات اور ذاتی شجاعت اور جذبے کے تحت پیچھے دھکیل دیا اور اب دندناتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔

اس بے اعلان کی جنگ میں آج پچھلے پہر کے اندھیرے میں جس بے جگری اور خود اعتمادی سے اپنے مٹھی بھر بہادروں نے دشمن کی اتنی بڑی فوج کو بھگا کر اپنی سرحدوں کی حفاظت کی ہے اس کی مثال اگر مل سکتی ہے تو تاریخ اسلام ہی میں مل سکے گی"۔

حجاب امتیاز علی جنگ کے آداب سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ جہاں وہ یہ جانتی ہیں کہ عالمی اداروں کے طے شدہ اصولوں کے تحت جب کوئی ملک کسی ملک پر حملہ کرتا ہے تو پہلے خبردار کرتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ جنگ کی صورت میں عام شہریوں کو کیا کرنا چاہیے؟ کیا احتیاطی تدابیر کرنا چاہئیں کہ ہمارا کم سے کم نقصان ہو۔ وہ اس جنگ کو ایک باشعور شہری کی طرح دیکھتیں رہیں اور اس کے بارے میں لکھتی رہیں۔ اس ضمن میں ان کے روزنامچے سے ایک اقتباس دیکھیے:

"پچھلے پہر کے وقت کوئی ۳ بجے تھے کہ یاسمین نے دفعتاً مجھے آواز دی: "اٹھیے اٹھیے! نہ جانے کیا بات ہے کہ نیچے باغ میں نوکر غل مچا رہے ہیں اور سڑک پر پولیس کے سپاہی غل مچا رہے ہیں کہ ساری روشنیاں فوراً گل کر دیجیے، خطرہ ہے۔ میری کوٹھی سے ملی ہوئی کوٹھی صوبائی وزیر خزانہ مسعود صادق صاحب کی ہے، ان کے بندوقچی نے بھی چلانا شروع کر دیا۔ روشنی بجھایے خطرہ ہے۔ اس فقرے کا مطلب میں بالکل نہ سمجھ سکی کہ روشنیاں آخر کیوں بجھائی جا رہی ہیں اور خطرہ کس نوعیت کا ہے۔ کیا نوکروں نے کوئی خواب پریشاں دیکھا ہے؟ لیکن ان کے اس خواب پریشاں کی تعبیر ہمیں دن کے گیارہ بجے تک نہ معلوم ہو سکی۔ کیونکہ اس وقت تک زندہ دلانِ لاہور زندگی کی دلچسپیوں میں اپنی روایتی شہر کے مطابق مگن تھے"۔

جنگ کے دنوں میں ایک باشعور شہری کو کس قسم کا رویہ اپنانا چاہیے؟ اس کا جواب حجاب امتیاز علی نے یوں دیا ہے:

"اس وقت سارے ملک میں مکمل بلیک آؤٹ ہے۔ ابھی ابھی میں اوپر کی منزل میں گئی تاکہ سڑکوں کا نظارہ کروں اور اگر کہیں روشنی کی لَو بھی نظر آجائے تو فون کر کے اسے بجھوا دوں۔ مگر کسی پاکستانی گھر کی کسی کھڑکی میں سے بھی روشنی کی کوئی لَو نظر نہیں آئی۔ بچے بچے کو گھنٹوں میں اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ جب اپنے ملک اور اپنے شہر میں جنگ چھڑ جائے تو اس کے کیا آداب و احکام ہوتے ہیں"۔

ہر ادیب کی طرح حجاب امتیاز علی بھی جنگ کے بجائے امن اور محبت کرتی تھیں۔ انھوں نے اپنے روزنامچے میں جنگ کا قلق یوں بیان کیا ہے۔

"امتیاز بیٹھے اعلانات سن رہے ہیں۔ میرے سامنے موم بتی اور ہاتھ میں قلم ہے۔ ساری زندگی قلم پکڑے گزر گئی ہے۔ اسی قلم نے امن کے دنوں میں بہاروں کی تصویر کشی کی ہے۔ بنی نوع انسان کی محبت کی داستانیں لکھی ہیں۔ انسان سے انسان کے پیار اور امن و آشتی کی

کہانیاں نقشِ قرطاس کی ہیں۔ کیا اب اسی قلم سے میدانِ جنگ کی دہشت خیزی اور خونریزی اور انسان کی انسان دشمنی کی خوفناک حقیقتیں لکھی جائیں گی؟"

دیکھا جائے تو حجاب امتیاز علی کا یہ روزنامچہ انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ انھوں نے اس میں جابجا جہاں اپنے ذاتی مشاہدات، تجربات اور خیالات بیان کیے ہیں وہاں پوری پاکستانی قوم کے جذبات کی ترجمانی بھی کی ہے۔ اسے ان کے اس روزنامچے کی انفرادیت ہی کہا جانا چاہیے۔ اپنے اور قوم کے جذبات کی ترجمانی کے لیے انھوں نے اپنے پسندیدہ شاعر علامہ اقبالؒ کے بہت سے شعر اور مصرعے بھی اس روزنامچے میں درج کیے ہیں۔ کچھ دیگر شاعروں کے اشعار اور مصرعے بھی انھوں نے ان کے نام لکھے بغیر درج کیے ہیں۔

یہ سرحدوں ہی پہ دشمن کو روک دیتے ہیں
نظر اٹھا کے بھی دیکھے تو ٹوک دیتے ہیں

....

زندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائیں گے دن

....

جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

....

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

....

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے
کاٹ کر رکھ دیے، کفار کے لشکر کس نے

....

زندہ رہے گا ، زندہ رہے گا
سیالکوٹ تو زندہ رہے گا

....

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

....

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

....

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

....

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

....

اے شہیدانِ وطن تم پہ سلام
تم نے روشن کر دیا ، ملت کا نام

....

جنگ عام طور پر انسانی ذہنوں پر نہایت منفی اثرات مرتب کرتی ہیں لیکن یہ پاک بھارت جنگ ایسے جذبے سے لڑی گئی کہ ساری پاکستانی قوم کے جذبات ہی بدل گئے۔ آپس کے اختلافات دم توڑ گئے تھے۔ معاشرتی خرابیاں معدوم ہو گئی تھیں۔ قوم صحیح معنوں میں قوم بن گئی تھی۔ حجاب امتیاز علی لکھتی ہیں:

"پاکستانی وہ عظیم قوم ہے کہ جس کے مجرم قیدی بھی دورانِ جنگ میں ایک سچے پاکستانی بن کر قوم کی صف میں آ کھڑے ہوئے۔ اس کی مثال کسی تاریخ میں نہیں ملتی۔ شہری انتظامی کمیٹی کے

لوگ سخت فکر مند تھے کیونکہ جنگی قیدیوں کی تعداد بڑھ رہی تھی اور ان کے لیے جگہ کی ضرورت تھی۔ فکر اس بات کا تھا کہ ہمارے جیل کے پرانے قیدیوں کو حفاظتی انتظام کے بغیر دوسری جگہ کس طرح منتقل کیا جائے تا کہ دشمن کے قیدیوں کے لیے جگہ نکالی جائے۔ جب ہمارے مجرم قیدیوں نے اپنے محکمے کی یہ تشویش دیکھی تو مجرموں نے افسروں کو یک زبان ہو کر یقین دلایا کہ آپ ہماری حفاظت کے لیے فکر مند نہ ہوں۔ ہم کہیں نہیں بھاگیں گے صرف بتا دیجیے کہ ہم کہاں پہنچ جائیں۔ ہم خود پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ تمام قیدی وعدے کے مطابق بغیر کسی کی نگرانی کے مارچ کرتے ہوئے خود مقررہ جگہ پر پہنچ گئے اور دوران جنگ میں قیدی ہونے والے جنگی قیدیوں کے لیے جگہ خالی کر دی۔ جب میں نے یہ حیرت انگیز خبر اخبار میں پڑھی تو مجرموں کی شرافت اور حب الوطنی کے جذبے کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئی۔ جنگ سے پہلے ہمارے شہر خوباں میں روزانہ چوریاں اور قتل و خون کی وارداتیں وقوع پذیر ہوتی تھیں مگر جنگ کے دوران میں یہ تمام جرائم ختم ہو گئے۔

جی چاہتا ہے یہاں میں اپنے چوری پیشہ ہم وطنوں کو مخاطب کر کے کہوں کہ اے میرے وطن کے شریف طبیعت چورو! قوم تمھاری بھی شکر گزار ہے کہ تم نے جنگ کی اندھیری راتوں میں کسی کے گھر میں ناجائز طریق پر گھس کر اس کی کوئی چیز نہ چرائی۔ تمھارا یہ احسان ہم ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ اے چور بھائیو! اپنے وطن کی جنگ کے پُر آشوب زمانے میں تم نے اپنی شرافت کا ثبوت دیا۔ میری التجا ہے کہ اختتام جنگ پر امن کے خوشگوار زمانے میں بھی تم اپنا اخلاق بلند رکھو اور یہ ثابت کر دکھاؤ کہ پاکستان وہ مقدس ملک ہے جہاں رات کے وقت گھروں کے دروازے در امید کی طرح وا رہتے ہیں اور کسی قسم کے کسی جرم یا چوری کی واردات نہیں ہوتی۔ تم نے دیکھا ہوگا جنگ کتنی ہولناک چیز ہوتی ہے، تم نے محسوس کیا ہوگا کہ چوری اور کمینگی کے مقابلے میں شرافت اور نیکی کا احساس کتنا سکون بخش اور کتنا لطیف ہوتا ہے۔ جنگ کے دوران تم نے جس شرافت کا ثبوت دیا امن میں اسے نباہ کر دکھاؤ“۔

حجاب امتیاز علی کے اس سفرنامے کی زبان نہایت سادہ اور عام فہم ہے۔ رومانی ادیبوں کے ہاں جس طرح کا زبان کا شکوہ پایا جاتا ہے، وہ اس روزنامچے میں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ حجاب امتیاز علی کا یہ روزنامچہ ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے جب سینوں میں رکھے ہوئے دل آئینے کی طرح شفاف ہو گئے تھے۔ لوگ سچے پاکستانی بن کر سامنے آئے تھے۔ حجاب جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ انسانوں سے زیادہ فطرت کے حسن پر لکھتی ہیں، اس روزنامچے میں انسانی رویوں پر یوں روشنی ڈالتی ہیں کہ ان کے گہرے مشاہدے کی گواہی مل جاتی ہے۔ یہ روزنامچہ ہمیشہ حجاب کی امتیازی شناخت بنا رہے گا۔

☆☆☆☆☆

تنقید خلاق ذہن کا کمال

کسی تنقیدی کام کا تجزیہ محقق کر سکتا ہے کیونکہ اس قسم کے کام کے محاکمہ کے لیے تنقیدی دبستانوں کے جامع مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔اردو تنقید آغاز سے اب تک جتنے موڑ کاٹ چکی ہے اس کا درست علم اور مستعمل اصطلاحات کے مفاہیم سے آگاہی بہت ضروری ہے۔ مشاہدہ تو یہی کہتا ہے کہ تھیوری، ادبی تنقید، ادبی تھیوری ادبی تنقیدی تھیوری میں کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا۔ ابھی ان کے افتراقات کی نشان دہی بھی ناقدین پر فرض ہے۔ جن ناقدین کا علم اور فہم اس حوالے سے واضح ہے وہ قاری کی استعداد کی پروا کیے بغیر، بہت دلیری سے تنقید لکھ رہے ہیں، عام قاری ان کی تحریر پڑھ کر جھنجھلا اٹھتا ہے۔ کیونکہ اس پر درج بالا اصطلاحات کے مفاہیم واضح نہیں ہوتے ہیں۔اور جب کسی مضمون میں مابعد جدید اصطلاحات کا استعمال ہوتا ہے تو قاری مرعوبیت کے زیرِ اثر مطالعہ کرتا ہے اس کا ذہن ان اصطلاحات کو محض لفظ سمجھ کر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ نظری اور عملی تنقید کے مطالعے میں ریڈابلٹی کا بھی فرق ہوتا ہے،اصطلاحات کا استعمال اس لیے بھی ضروری ہے کہ ایک جامع مفہوم کو ایک لفظ سے ادا کیا جا سکتا ہے - شواہد یہی کہتے ہیں جب معاملہ غزل کی تنقید کا ہو تو اس قسم کی اصطلاحات عمومی طور پر کم برتی جاتی ہیں۔ غزل کی تنقید میں ان کی اشد ضرورت ہے۔نئے معاملات اور تصورات کی نظر سے غزل کو اب دیکھنا بہت ضروری ہے۔ تنقیدی نشستوں میں غزل پر بہت گفتگو ہوتی ہے، نظم پر قاری بات ہی نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل میں ردیف، قوافی، بحر، الفاظ اور تشبیہات سامنے ہوتی ہیں اور فوری بات کرنا ممکن ہوتا ہے۔ غزل پر برس ہا برس سے ایک قسم کی گفتگو پڑھ اور سن کر ذہن میں کچھ باتیں جڑ پکڑ جاتی ہیں اور انھیں کہیں بھی دہرا دینا بہت آسان ہوتا ہے۔ اس کے عقب میں کلاسیکی اساتذہ کا رویہ بھی جھلکتا ہے جن کی تنقید کا زور صحتِ لفظی، بحر، تشبیہ، استعارہ اور دیگر صنعتوں تک ہی محدود تھا۔ غزل کے حوالے سے ادبی تنقید کو متنی تحقیق کی قسم اور ایک تحقیقی طریقہ کہا جا سکتا ہے۔ تنقیدی نشستوں

توقیر عباس

کی وجہ سے اسے گفتگو کی صنف کہنا بھی بے جا نہیں ہے لیکن اس کے عامل کو ناقد کہنے پر دل مائل نہیں ہوتا۔ ادبی تنقید ایک رائے یا دلیل بھی ہو سکتی ہے، جس کی تائید موضوع، انداز، ترتیب یا تاریخی یا سیاسی سیاق و سباق جیسے شواہد سے ہوتی ہے۔ چونکہ زبانی یا تحریری تنقید دلائل کی مدد سے حقائق کا انشراح کرتی ہے، اس لیے تنقید کو دلائل کا مربوط نظام بھی کہا جا سکتا ہے۔ کسی متن کی کارکردگی کی جانچ پڑتال، چھان بین اور تعبیر و توضیح کرتے ہوئے تنقید جو کچھ بھی کہتی ہے وہ دلائل ہوتے ہیں۔ جب جانچ پرکھ کی بات ہوتی ہے تو اس سے مراد متن کا لسانیاتی نظام ہوتا ہے، جب غزل میں تشبیہات، استعاروں، صنعتوں اور عیوب کی تعداد کی بات ہو تو یہ تنقید کا حصہ ہونے کے باوجود تحقیق کے ذیل میں آتی ہے۔ ارتکاز نوید صادق کی پہلی تنقیدی کتاب ہے، جس میں انھوں نے اپنے معاصرین کی شاعری کا جائزہ لے کر کچھ نتائج مرتب کیے ہیں۔ جب کتاب پر نظر ڈالتے ہیں تو پہلے مضمون میں موضوعی انداز نظر سامنے آتا ہے۔ الطاف حسین حالی کے سوانحی عناصر، تنقید اور شاعری کے حوالے سے پہلا مضمون سرسری دل کی واردات نہیں ہے، سامنے آتا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے حالی پر کی گئی سابقہ تنقید کے نکات کی روشنی میں اپنے مضمون کی حد بندی اور بنیادیں استوار کی ہیں۔ مقدمہ شعر و شاعری کو جو در اصل شعری اخلاقیات کا ضابطہ ہے، نوید صادق تنقید کی پہلی کتاب قرار دیتے ہیں اور اس سے قبل شائع ہونے والی تنقیدی تحریروں کو تذکرہ کہتے ہیں۔ حالی کے خلاف ہونے والی تنقید کا ذمہ دار مقدمہ شعر و شاعری اور ان کا پانی پت سے بھاگ کر سر سید کے حلقے شامل ہونا ٹھہراتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ان دو وجوہ کی بنا پر حالی کی شاعری کے درست تجزیے نہ ہو سکے۔ حالی شادی کے حق میں نہیں تھے اور پھر گھر چھوڑ کر بھی بھاگ گئے تھے، کچھ ناقدین نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ حالی غزل اور عشقیہ شاعری کے قائل نہیں ہیں، نوید صادق ناقدین کے ان نتائج کے رد میں مقدمہ قائم کر کے، حالی کے اشعار سے اثبات کرتے ہیں کہ حالی کی دل کی واردات سرسری نہیں ہے۔ مضمون کے آخر میں نوید صادق خود کہتے ہیں کہ انھوں نے حالی کی شاعری کے اس حصے کو موضوع بنایا ہے جس کا عشق و عاشقی سے علاقہ ہے۔

تنقید محض ادبی متن کے بارے میں ہی بات نہیں کرتی بلکہ اپنے بارے میں بھی سوچتی ہے۔ اپنے وظائف Functions کے حدود کا تعین کرتی ہے، اسی وجہ سے آج تنقیدی نظریات جیسی اصطلاح بے دریغ برتی جاتی ہے۔ لیکن اس کے استعمال کنندگان مفہوم و معانی سے اکثر نا آشنا ہوتے ہیں، ان کے نزدیک تنقیدی نظریہ کی Plural form تنقیدی نظریات ہیں۔ ان کے وظائف، طریق ہائے کار اور

حدود کیا ہیں، اس کا شاید ہی کسی کو علم ہو۔ تنقیدی نظریات ادب کی نوعیت و فطرت کا احاطہ کرتے ہیں بلکہ کسی نہ کسی طرح ادب کی Definition کا تعین بھی کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ تنقیدی نظریات عظیم عوامل ہیں جو ادب کے بارے میں بیش قیمت معلومات فراہم کرنے کے علاوہ علم کی جانچ پرکھ اور نشو و نما میں بہت معاون ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ شعر مضمونِ صد رنگ ہے تو تنقید جلوہ صد رنگ دکھانے پر قادر ہو چکی ہے، بے جا نہیں ہوگا۔ روایتی تنقید سے مابعد جدید عہد تک کسی زاویہ نظر کو متروک نہیں کیا گیا ہے۔ اس تنقیدی سفر کو ہم ونڈوز کے ماڈلز کہہ سکتے ہیں۔ جدید ونڈوز میں سابقہ ونڈوز کے فیچرز کسی نہ کسی صورت میں موجود رہتے ہیں۔ مابعد جدیدیت کے فکری و تنقیدی نظریات میں سابقہ تنقیدی نظریات کے عناصر کسی نہ کسی طرح ضرور موجود ہیں۔ مابعد جدید نظریات نے زبان کے قواعد جیسے مہابیانیے کی اسیری میں مہابیانیے کی نفی کی ہے۔ قواعد آج بھی روایت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس روایت کے ترک کا صاف مطلب ایک بے ضابطہ و بے معنی چیز کی تشکیل و ترویج ہے۔ اردو تنقید پر نظر ڈالیں تو اس کے ابتدائی نقوش معروضی زاویہ ہائے نظر کے حامل نظر آتے ہیں جو بتدریج موضوعی زاویہ ہائے نظر میں منقلب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ معروضی زاویہ ہائے نظر متن کی ظاہری ساخت، اور بیان و بدیع کے مباحث کو محیط تھے۔ بعد میں کچھ مفکرین نے متن کے اندرون میں اتر کر فنکار کے موضوعات دریافت کرنے کی کاوش کی۔ اس کاوش کے اثرات کے پھیلاؤ کے ساتھ سطحیت نے قدم جمانا شروع کر دیے۔ خاص طور پر غزل کی تنقید اسی کا شکار ہو کر رہ گئی۔ کسی بھی کتاب میں سے اشعار کے کچھ سیٹ تیار کر کے، ان کے مطابق عبارتیں گھڑی جاتی رہی ہیں اور گھڑی جا رہی ہیں۔ پرچوں، جریدوں، شماروں اور تعلیمی نصابوں میں غزل کے تنقیدی مضامین میں چار پانچ موضوعات کی دریافت کا اتنا ڈھیر لگ چکا ہے کہ اگر وہ کتابی صورت میں شائع ہوں تو ان کے جلانے کے لیے کئی ہلاکو خان اور کئی دہجلے کم پڑنے کا امکان ہے۔ کسی بھی غزل کی کتاب میں موجود مضمون یا دیباچے میں معاصر فکر، سماجی و سیاسی شعور، مذہبی اور تصوفانہ رنگ، عارفانہ عناصر و اجزا اور ہجر وصال جیسے عناصر کی دریافت اور ان کے مطابق شعری مثالوں کا ڈھیر ہوتا ہے۔ اکثر مضامین کے عنوانات کا مضمون کے متن سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ صرف آج کے عام رویے کی بات ہے۔ مستثنیات تو ہر دور میں ہوتی ہیں۔

تنقید کو کچھ لوگ تخلیق کا مرہونِ منت کہتے ہیں۔ اسے خود کفیل سمجھنے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔

وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ جب بھی کوئی تنقیدی مضمون لکھا جاتا ہے تو آغاز میں اس کے حدود کا تعین کیا جاتا ہے اور فن پارے کو ان حدود میں لا کر دیکھا بھالا جاتا ہے۔ ارتکاز کے دوسرے مضمون 'شک کا عذاب' میں نوید صادق نے طویل تمہید باندھی ہے اور تنقیدی دائرہ کھینچ کر منیر نیازی کی شاعری پر بات کی ہے۔ جب نوید صادق یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ محبت کیا بلا ہے، اس کے درجات کیا ہیں، جس شاعری کی ہم بات کر رہے ہیں، اس کے ہاں محبت ہے یا اور کچھ؟ تو اصل میں اپنی تنقیدی حدود کا تعین کرتے ہیں اور اسی کے اندر رہتے ہوئے مختلف مفکرین کی آرا اور منیر نیازی کے اشعار سے اپنی بات کا اثبات کرتے ہیں۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دیگر ناقدین کی طرح ایک عنوان دے کر تحریر کو سیاسی، سماجی، تاریخی، مذہبی، جدید قدیم وغیرہ کی سرخیوں میں تقسیم کر کے انتشار کا شکار نہیں کرتے ہیں۔

سوانحی، تقابلی، اخلاقی، تاریخی، حقیقت پسندانہ، نفسیاتی، سماجی نقدِ نظر نے بھی اپنی جگہ بنائے رکھی بلکہ ان موضوعات پر ابھی تک سندی مقالہ جات بھی لکھے جا رہے ہیں۔ معنی کی غیر حتمیت اور مصنف کی موت کے اعلان کے ساتھ سوانحی و تقابلی تنقید کا زور ٹوٹ گیا۔ نئی تنقید اور مابعد جدید نظریات نے معنی کے مسلسل التوا اور تغیر پر زور دیا اور متن کو خود کفیل اکائی قرار دیا۔ جس کے نتیجے میں متن کے اندر سے معنی برآمد کیے جانے پر زور صرف کیا جانے لگا اور ہر لفظ نشان اور علامت کا کام کرنے لگا۔ نوید صادق نے کہیں بھی اس قسم کی یک جہتی تنقید کو نہیں آزمایا ہے۔ اکثر مضمون سے پہلے اپنے موضوع کا احاطہ کر کے بات آگے بڑھائی ہے۔

ادبی تھیوری آفاقی حیثیت اختیار کر چکی ہے، جس کے اصول وضوابط کا دنیا کی ہر زبان و ادب پر اطلاق ممکن ہے۔ ارسطو کے دور سے بھی پہلے سے لے کر انیس سو پچاس تک جہاں جہاں بھی کوئی تنقیدی نظریہ تھا، اسے روایتی تھیوری کہا گیا کیونکہ اس کا انحصار جمالیات پر تھا، جمالیات کو ادب کی تخلیق کی ہدایات، قواعد اور اصول وضوابط کہہ سکتے ہیں۔ جمالیات اساس ادب ہر جگہ یکساں تھا چاہے وہ کسی بھی نظریے کے تابع ہو کر لکھا جا رہا تھا۔ جدیدیت اور مارکسی ادب میں شخصی مخالفت تھی لیکن جمالیاتی طور پر یکساں تھے کہ دونوں خاص ہدایات کے زیرِ اثر تخلیق کیے جا رہے تھے۔

قاری حیرانی کا اظہار کر سکتا ہے کہ تھیوری کی آمد سے صدیوں پہلے ارسطو کا دور تھا، اس کا اس تھیوری سے کیا تعلق ہے؟ جواب یہ ہے کہ ارسطو نے بھی اچھے اور بڑے المیہ Tragedy کے اصول وضوابط طے کیے تھے کہ المیہ میں ہیرو بہت بڑا آدمی ہو، ولن ایسا ہو جس کے قتل کی خواہش ہر ذہن میں جاگ اٹھے اور جب وہ قتل ہو تو لوگ خوشی محسوس کریں۔ کیا یہ ادب کی تخلیق کے اصول و ضوابط نہیں ہیں؟ ایک اور سوال بھی کیا جا سکتا

ہے کہ ارسطو اور افلاطون تو ایک دوسرے کے مخالف نظریات کے حامل تھے تو افلاطون کے نظریات روایتی تھیوری میں کیسے شامل ہو سکتے ہیں؟ جواب یہ ہے کہ افلاطون اصلاح پسند اور مذہبی شاعری کا قائل تھا، جو شاعر دیوی دیوتاؤں کی حمد و ثنا کرتا ہے یعنی مذہبی شاعری کرتا ہے وہ صحیح العقل ہے اور دیگر شعرا کو مثالی ریاست سے نکال دینا چاہتا ہے۔ یہ افلاطونی جمالیات تھی۔ درج بالا تفصیلات کی اس لیے ضرورت تھی کہ ناقد جب کسی فن پارے کی طرف پیش قدمی کرتا ہے تو تمہید میں بنیادی طور پر جس زاویہ نظر کو اپناتا ہے وہ حقیقت میں اس کی جمالیاتی قدر ٹھہرتا ہے۔ جتنا بڑا خلاق ذہن ہوگا اس کے تنقیدی حدود بھی اسی طرح وسیع اور بڑے ہوں گے۔ نوید صادق کی تنقید کا انحصار تنقید میں خود عقلی طور پر ابھرتے ہوئے نظم و ضبط کے عوامل پر ہے۔ 'احمد مشتاق کو سمجھنے کی پہلی کوشش' میں، نوید صادق نے مغربی ناقدین، مفکر اور شعرا کے حوالے سے کلاسیکیت، رومانویت جیسے تنقیدی دبستانوں کی بات کرتے ہوئے ساڑھے چار صفحات پر محیط اپنا مقدمہ قائم کر کے، اپنی تنقیدی حد کا تعین کیا اور بعد ازاں اسی تناظر میں احمد مشتاق کی تخلیقات کا جائزہ لیا اور اس میں مضمر نئی سچائیوں کی دریافت کا فریضہ انجام دیا ہے، جن کی بدولت احمد مشتاق اپنے معاصرین سے الگ اور منفرد حیثیت کا حامل شاعر ٹھہرتا ہے۔ یہ جو بار بار تنقیدی حدود کے تعین کی بات ہو رہی ہے، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگ تنقید کو تخلیق کا محتاج کہتے ہیں، حالانکہ ایسی بات ہرگز نہیں ہے۔ تنقید خود کفیل ہے اور ہر فن پارے کے لیے الگ الگ قضیے اور مقدمے قائم کرتی ہے۔ تنقید مخالف یا نقاد مخالف اذہان شاید زبان کے قواعد، صنعتوں کی نشان دہی، لفظ کے درست استعمال کی اسناد اور بحور کی نشان دہی، کو تنقید سمجھتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ لوازمات شعری ہیں۔ کبھی کبھی احساس ہوتا ہے، ایسے اذہان درسِ نظامی کے فارغ التحصیل ہیں جنھوں نے لفظ کی سند کا معیار چند کلاسیکی شعرا اور اساتذہ کو ٹھہرایا، یہ علم الرجال جیسا ہی معیار ہے۔ جس کی مدد سے علما نے حدیث کے سچے راویوں کی پرکھ کی اور ان کی احادیث کو مستند ٹھہرایا۔

ارتکاز میں نوید صادق نے تقریباً اپنے سینیر اور جونیر معاصرین کی شاعری کا جائزہ مختلف عنوانات کے تحت لیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے کسی زمانے میں نظم کو شعرا کے لیے اسی قسم کے موضوعی مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا جیسے مجید امجد کی شاعری توازن کی ایک مثال۔ نوید صادق پر ان مضامین کے تو اثرات نہیں ہیں لیکن انداز نقد میں ایک موضوعی کی مماثلت ضرور ہے۔ اس قسم کے مضمون کی بہترین مثال 'خورشید رضوی کا ناسٹلجیا' ہے جس میں نوید صادق نے ناسٹلجیا کے بارے میں قدیم و جدید نظریات کا احاطہ کرتے ہوئے ان کی چھان بین کی ہے۔ اپنی

تنقیدی بصیرت کے موافق ناسٹلجیا کی مناسب و موزوں اقسام کا اطلاق خورشید رضوی کی شاعری پر کیا ہے۔ اس مضمون میں جس قسم کی حد بندی ہے وہ اصل میں تحقیقی کام ہے۔ یہ بھی کہنا درست ہوگا کہ تاثراتی تنقید کی حدیں بھی ہوا کرتی ہیں، قاری کے ذہن میں ادب کے کچھ معیارات ہوتے ہیں کہ ادب کیسا ہونا چاہیے، یہی معیارات اصل میں جمالیات بھی ہیں اور تنقیدی حد بندی بھی ہے۔ اسی حد میں رہ کر تخلیقات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

'محسن اسرار کی شاعری میں گھر کی اہمیت'، میں نوید صادق کسی حد تک نئی تنقید جیسا رویہ اپناتا ہے، یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ جدیدیت اور نئی تنقید میں بہت فرق ہے۔ نئی تنقید صرف متن کی تعبیر و توضیح اور معانی آفرینی تک محدود ہے جبکہ جدید ادب کیسا ہو، کی علم بردار یعنی جمالیات اساس تحریک ہے۔ اس مضمون میں نوید صادق محسن اسرار کی شاعری میں گھر کی علامتی جہتوں کی نشان دہی کرتے ہیں اور اس کے علامتی معنوں کی وضاحت کرتے ہوئے شعری مثالیں درج کرتے ہیں۔ شعری مثالوں کی کثرت نے مضامین کی قرات میں اضافہ کیا ہے۔

کچھ مضامین میں نوید صادق نے تاثراتی انداز اپنایا ہے جن میں کوئی مربوط تنقیدی حد بندی نظر نہیں آتی ہے، ممکن ہے کہ یہ مضامین کسی فوری ضرورت کے تحت لکھے گئے ہوں، یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مضامین کتب کے دیباچے ہوں یا پرچوں کے مدیران کی طلب اور تقاضے پر لکھے گئے ہوں، درست صورت حال کا اندازہ نہیں ہے۔ 'تشبیب پر ایک نظر'، 'نم گرفتہ--- خالد احمد کی غزل'، 'ازل--- ایک مطالعہ'، 'اعجاز گل کی شاعری'، 'روحِ قدیم کی قسم--- صابر ظفر کا شعری مجموعہ'، 'ممتاز اطہر--- عدم تکمیل سے تکمیل تک'، 'بدل گئی ہے بہت آس پاس کی صورت'، 'شفیق سلیمی کی غزل--- ایک مطالعہ'، 'دل ملا بھی تو ملا کیا خالد'، 'گلی گلی میں ملی ہیں محبتیں تیری' جیسے مضامین میں یک موضوعی مضامین کی کیفیت نظر نہیں آتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان مضامین میں نوید صادق شاعر کی تخلیقات کے تمام پہلوؤں کو سمیٹنا اور مختلف شیڈز دکھانا چاہتا ہے۔ تنقید کا یہ بہت معروف انداز ہے، شاید اسی قسم کے مضامین لکھاری کی خوشی کا باعث بھی ہوتے ہیں۔ وہ بڑے فخر سے دوستوں میں کہہ سکتا ہے کہ فلاں نقاد نے مجھ پر مضمون لکھا ہے اور میری شاعری کے اتنے پہلو دریافت کیے ہیں۔

ادبی شخصیات کے کام کے لئے درست اور موزوں حد بندی بہت ضروری ہوتی ہے، اس کے بغیر تنقید میں تنوع پیدا ہی نہیں ہو سکتا ہے۔ اس قسم کی حد بندی وسعتِ مطالعہ، تجزیاتی قوت، تحقیق اور عملی تنقید کے بغیر ناممکن ہے۔ 'ارتکاز' نوید صادق کی مخلصانہ اور غیر مشروط کاوش و سعی ہے، ناقدین کی غزل سے بے اعتنائی کا ازالہ بھی اور الزام کنندگان کو سود کے ہمراہ ایک تسکین بخش جواب بھی ہے۔

☆☆☆☆☆

غلام عباس کے افسانوی اسلوب بیان اور دو افسانے ''لچک'' اور ''سرخ گلاب'' پر تفصیلی تبصرہ

غلام عباس اردو ادب کے ایک منفرد افسانہ نگار ہیں انہوں نے زیادہ تر سماجی معاملات کو اپنا موضوع بنایا۔ وہ بہت کم عمری سے افسانہ لکھ رہے تھے لیکن شروع سے ہی ان کے افسانے کا موضوع کبھی محبت یا عورت نہیں رہی تھی۔ بلکہ وہ ہمیشہ معاشرے کے مجموعی تاثر کو ہی اپنے افسانے کا موضوع بناتے۔ ان کے موضوعات میں بلاشبہ تنوع پایا جاتا ہے۔ لیکن زیادہ تر افسانے طرز زندگی، فرقہ پرستی اور انسان کی نفسیات پر ہی مبنی ہیں۔ وہ ایک موضوع کو لے کر چلتے ہیں اور پھر اسے پرت در پرت کھولتے چلے جاتے ہیں، تمام مضمرات پر بات کرتے ہیں لیکن کہاں اختتام کر دیں اور قاری کے سوچنے کے لیے راستہ ہموار کر دیں کچھ پتا نہیں چلتا۔

مذکورہ افسانہ ''لچک'' مذہبی فرقہ واریت پر مشتمل ہے۔ ایک حساس لکھنے والا اپنے اندر کئی معاملات پر الجھتا رہتا ہے اور کبھی کبھار تو وہ اپنے تئیں ان مسائل کے حل بھی تلاش کر لیتا ہے وہ سمجھتا ہے اگر اس طرح کیا جائے تو معاملات میں بہت زیادہ بگاڑ نہیں آئے گا یہی وجہ ہے کہ وہ اس موضوع کو اپنے طور پر لکھ کر پڑھنے والوں کو اس مسئلے کا اپنی طرف سے حل دے دیتا ہے۔

اس افسانہ میں بھی غلام عباس نے یہی کہا ہے کہ ہم اپنے بنیادی رویوں میں لچک لا کر مسائل کی شدت کم کر سکتے ہیں۔ وہی مسائل جو قتل و غارت گری کی وجہ ہوتے ہیں ذرا سی لچک سے آسانی سے سلجھ بھی سکتے ہیں۔ اس بات کا سارا دارومدار انسان پر ہے۔

افسانہ ''لچک'' ایک متوازن سوچ کے حامل بندے کی تقریر پر مبنی افسانہ ہے۔ آخر تک تقریر کا تسلسل ہی رہا ہے۔ کوئی موڑ یا تبدیلی نہیں آئی۔ اس طرح کے تجربات اکثر اوقات ہمیں غلام عباس کے ہاں ہی ملتے ہیں۔ ایک ہی صورتحال کو افسانہ بنانے کا فن اور مہارت اس مصنف کی خوبی ہے۔

اس افسانے میں وہ کہتے ہیں کہ مسائل کو بہت بڑا اور بڑھا وا دے کر دیکھا جائے تو بہت سے فرق نکل آتے ہیں، تضادات تنگ کرتے ہیں لیکن اگر متوازن نقطۂ نظر اپنا لیں تو کوئی مسئلہ بڑا نہیں لگتا۔ لکھتے ہیں کہ:

ثمینہ سیّد

"جب اس حیّ قیوم اور کائنات کے مالک نے کائنات کو تخلیق کیا تو اپنے ایک فرشتے "برہما" کے وسیلے سے نوعِ بشر کی ہدایت کے لیے ایک کتاب "مسمّی بہ وید" نازل کی۔ اس کے چار دفتر ہیں۔ اور امر و نہی کے احکام اور ماضی و مستقبل کے واقعات ہیں۔"

غلام عباس اپنے اس افسانے میں ہندو مذہب کو اہل کتاب کہہ کر معاملے کی شدت کو ہی کم کرنا چاہتے ہیں وہ لڑائی ختم کرنے کے متمنی ہیں وہ ہندو اور مسلم مذہب میں ڈھیروں مماثلت تلاش کرتے چلے جاتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ صدیوں سے ساتھ رہنا بھی دلوں اور نسلی سلسلوں کو کہیں نہ کہیں جوڑتا ہے جو بھی نفاق ہے وہ ہمارا اپنا پیدا کردہ ہے۔ مصنف اصل میں امن کا علمبردار ہوتا ہے۔ وہ جنگ کی نفی کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ اس کے نزدیک کافی مضبوط ہے جس کے لیے غلام عباس انسانی رویوں میں لچک کے قائل ہیں۔ اس افسانے میں انہوں نے نرم روی اور انسانیت کی انتہا کر دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"برادرانِ اسلام ہندوستان کی حیثیت اس وقت ایک سیکولر کی ہے یعنی لادینی مملکت کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں نہ تو اسلام کی کوئی اہمیت ہے نہ ہندو دھرم کی اور نہ ہی سکھوں، عیسائیوں اور پارسیوں کے مذہب کی اور میں سمجھتا ہوں یہی وہ سیدھا اور سچا راستہ ہے جس پر چل کر ہمارا ملک ترقی کر سکتا ہے۔"

مصنف کی اصل خواہش امن ہے۔ وہ کچھ چھوٹے موٹے تفرقات کو نظر انداز کر کے وسیع القلبی کی ضرورت پر زور دے رہا ہے کہ یہی ایک صفت امن قائم کر سکتی ہے۔

لچک پیدا کرنے کی انتہا دیکھیے لکھتے ہیں کہ:

"کیا حرج ہے کہ میں آج چھپ کر بھی گائے کی قربانی نہ کر سکوں۔ یہ کوئی پن کا کام تو ہے نہیں اور پھر کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا اگر میں اردو کو دیوناگری رسم الخط میں لکھوں۔ خط کا مضمون تو وہی رہے گا۔"

یہ اس وقت کے ایک مسلمان مصنف کی امن کے لیے ایک انتہائی کوشش کہی جا سکتی ہے کہ وہ ہر ایک بات میں لچک نکال رہا ہے حالانکہ جانتا ہے کہ ہندو شدت پسند ہیں اور یہ بھی کہ وہ مسلمانوں کا استحصال کر رہے ہیں۔ اسی افسانے میں ان مصائب و آلام کی طرف بار بار اشارہ کرتے ہیں جو مسلمانوں کو درپیش ہیں لیکن پھر بھی امید کا دامن تھامے ہوئے ہیں کہ حالات بدل بھی سکتے ہیں۔ اگر ہم کم تعداد میں ہیں تو ہمارا ہی فرض بنتا ہے کہ ہم اپنی وفاداری اور برابری کا یقین دلاتے رہیں۔

غلام عباس مسلمانوں کو درپیش مسائل سے پوری طرح آگاہ تھے لکھ بھی رہے ہیں لیکن اس سب کے باوجود رویوں میں لچک نکال کر امن کا بول بالا کرنا چاہتے ہیں۔

سرخ گلاب: "سرخ گلاب" ایک طویل افسانہ ہے اسے علامتی افسانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ سرخ گلاب کو ایک وحشی گلاب کے طور پر لیا جاتا ہے۔ یہ محبت کی وحشت ہے۔ جنگلی گلاب محبت

کی نشانی ہے۔ غلام عباس جیسے ماہر افسانہ نگار نے بہت حساس موضوع پر یہ افسانہ لکھا ہے۔
مرکزی کردار ''کاکی'' کی صرف ماں تھی جو نائن تھی۔ دیہات میں یہ کردار عام طور پر بڑے گھروں میں کھانے پکانے، بچے پالنے والی عورت کو کہتے ہیں۔ یہ بچی اس نے کیسے پیدا کی اور اس کا باپ کون تھا یہ بات کسی کو نہیں پتا۔ کسی کو اس سے دلچسپی بھی نہیں۔ بچی جس کا نام ''کاکی'' رکھ دیا گیا وہ بھی گاؤں کے گھروں میں مفت کی نوکرانی میسر آ گئی۔ اس افسانے میں منظر نگاری خوب اچھی اور باریک بین کی گئی ہے۔ ماحول کا نقشہ کھینچ کے اور کرداروں کے مشاغل سے اصل مدعا جو کہ اندھی مذہبی عقیدت ہے۔ اس کی نشاندہی کی گئی ہے۔ پیر حضرات کے مزاروں پر جا کر دھاگے باندھنے سے بچے کس طرح پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ ہمارے معاشرتی المیے ہیں جن پر لکھنا بھی ایک طرح کا جہاد ہے۔ اس افسانے کے کردار اپنی طرزِ زندگی کو خود دکھا رہے ہیں۔ گاؤں کے ماحول میں سادگی صرف اسی ایک کردار کاکی میں ہی ہے جو اب بچی سے جوان ہو چکی ہے۔ جسے دنیا کا زیادہ علم نہیں۔ جو نیم پاگل ہے۔
'کاکی' کو مرکزی کردار بنا کر مصنف نے سماجی برائیوں اور نیت کی کمینگی کو کئی کرداروں اور مثالوں کے ذریعے عیاں کیا ہے۔ ایک کمزور اور لاوارث لڑکی کا معاشرہ کیا حال کرتا ہے۔ پھر حویلیوں کے اندر کیسے کیسے راز چھپے ہوئے ہیں۔ جو اس افسانے میں اپنی کراہیت زدہ شکل کے ساتھ نظر آ رہے ہیں۔ جیسے کہ گنڈیریاں لگانے والا ''مولا'' اس پاگل سی لڑکی کی لاپرواہ اور چڑھتی جوانی کو حریص نظروں سے دیکھتا ہے اسے گنڈیریاں کھانے کا لالچ دیتا ہے۔ لیکن اس بیچاری کو زندگی میں کچھ اچھا نہیں ملا تھا یہ بھی وہ حاصل کرنے کی سمجھ ہی نہیں رکھتی تھی۔ وہ تو گاٹھیں کھا کر ہی خوش تھی اور گاؤں کی امیر عورتیں جب منتوں مرادوں کے لیے شاہ ولیؒ کے عرس پر مزار جاتی ہیں تو اسے بھی ساتھ لے جاتی ہیں۔ وہ معصوم اور دنیا کی چالاکیوں سے بے خبر ہے۔
وہ بھی ان سب عورتوں کی طرح اور اپنی ذیلدارنی کے طرح اپنے لیے بچے کی خواہش اور دعا کرتی ہے۔ وہ نہیں جانتی کہ شادی شدہ عورتوں کو ہی بچے پیدا کرنے کی خواہش اور اجازت ہے۔ وہ شادی شدہ ہو کر جیسے بھی اپنی اس خواہش کو ممکن بنا لیں وہ جرم نہیں لیکن اس معصوم کاکی کو کوئی سمجھانے یا سنبھالنے والا نہیں۔ ذیلدارنی اسے سرخ گلابوں والی قمیض پہنا کر تیار کر لیتی ہے اور ساتھ لے جاتی ہے۔ کاکی کو وہاں گنڈیریاں بیچنے والا مولا بھی نظر آتا ہے۔ وہ تو سرخ گلابوں والے کپڑوں میں سجی سنوری جھلی سی کاکی کو پہچان ہی نہیں پاتا۔ حیران پریشان ہو کر حرص زدہ نظروں سے اسے دیکھتا رہ جاتا ہے۔
مصنف نے کاکی کا پیٹ سے ہونا اور اس کی ابتدائی علامات ظاہر ہونے پر اس کم عقل کی خواہش پوری ہونے پر خوش ہونا اس مہارت

سے دکھایا ہے کہ کہیں بھی اس کی گرفت افسانے پر کمزور نہیں ہوئی۔ اسکے ساتھ ہی دوسروں کا اس سے نفرت کرنا اور اسے علاقے سے باہر پھینک دینا ہمارے معاشرے کے دوغلے پن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ پھر عرس قریب ہے پھر عورتیں تیار ہو کر اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے فور دراز سے اپنے شوہر یا گھر والوں کے ساتھ مزار پر آتی ہیں۔ انتہائی تہذیب سے مصنف نے اس بدتہذیب سماج کو آئینہ دکھایا ہے۔ آخر تک تجسس برقرار رہا ہے۔ کہ کاکی کے بیٹے کا باپ کون تھا۔ اس جیسے سیدھے اور کم عقل لوگوں کو بھی ظالم سماج معاف نہیں کرتا۔ آخر کار وہ جھنجلا جاتی ہے۔ جو مرد کتوں کی طرح اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں وہ انہیں کاٹ کھانے تک کی نوبت پہ آجاتی ہے۔ انسانیت کا فقدان اور حرص ہوس کی زیادتی نے اس افسانے کو بہت خاص رنگ دیا ہے۔ اس مہارت سے افسانہ نگار زمانے کے بے رحم رویوں کو بے نقاب کرتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

شروع میں جب افسانہ نگار نے اس پاگل سی لڑکی کے بارے میں کچھ ایسا نقش کھینچا۔

''وہ سارے کام ہنسی خوشی کیا کرتی۔ کسی کسی دن گاؤں والوں کی بکریاں چرانے پہاڑوں پر لے جاتی جہاں چن شاہ ولی کا مزار تھا۔ اور صلے کا خیال تک نہ آتا کسی نے کچھ روکھا سوکھا دے دیا تو کھا لیا۔ پھٹا پرانا کپڑا دے دیا تو پہن لیا۔ وہ اپنے حال میں مست تھی۔''

لیکن ہمارا معاشرہ جو انسان کے وجود میں حیوانوں سے بھرا ہوا ہے ایسی معصوم، اللہ لوک لڑکی کو بھی معاف نہیں کرتا۔ ہر لحاظ سے زندگی اس پر تنگ کر دی۔ پھر بھی عزت کے دوہرے معیار ہیں کہ جب وہ حاملہ ہو گئی اور وہ بیچاری اپنی خطا سے بے خبر تھی اسے ہی نفرت کا نشانہ بننا پڑا اور گاؤں کی عزت کو وجہ بنا کر دور جنگل میں چھوڑ دیا گیا۔ لیکن وقت بھی بہت بے رحم ہے انہی لوگوں کو پھر اس کے سامنے لا کھڑا کیا یہ سفاک شکاری اسے پھر بھی معاف کرنے کو تیار نہیں تھے۔ تو اختتام تک اس لڑکی کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ:

''اب گاؤں کے آدمی اسے پکڑنے کے لیے دوڑے مگر وہ ان کے آگے آگے ہی رہی، ایک دفعہ تو دو آدمیوں نے پکڑ بھی لیا۔ لیکن وہ وحشی بنی ہوئی تھی۔ ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی۔ یہ تعاقب رات بھر چلتا رہا۔''

یہی وہ لوگ تھے جو اسے اس کی خدمات کے صلے میں ایک وقت کی روٹی اور رہائش نہیں دے پائے تھے اسے بے عزت کر کے اور گناہ گار بنا کر جنگل میں چھوڑ گئے تھے اب جب سب ایک ساتھ اس پر جھپٹ پڑے تو وہ بھی وحشی بن گئی یہاں تک کہ اس نے ایک شخص کا کان ہی کاٹ ڈالا۔ کیونکہ وہ ان درندوں سے خود کو بچانا چاہتی تھی۔ غلام عباس کہانی میں جزئیات نگاری ایسی کمال کرتے ہیں کہ مناظر فلم کی طرح ذہن کے پردہ سکرین پہ ابھر آتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

استغاثہ _ فکشن یا فیکشن

ڈاکٹر غافر شہزاد کا ناول ''استغاثہ'' سرکاری دفاتر میں ہونے والی سازشوں، ریشہ دوانیوں، ناانصافیوں اور بے ضمیری کی کہانی ہے جسے انھوں نے کمال خوبصورتی اور مکمل جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے- یہ ناول ہر سرکاری ملازم کو اپنے گریبان میں جھانکنے پر اُکساتا ہے- یہ ایک ایسا سچ ہے جس کو جاننے والا اس سچ سے نظریں چراتا پھرتا ہے- یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں سرکاری ملازم اپنا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتا- وہ بے ضمیری کے بوجھ تلے ہی زندگی گزارنا چاہتا ہے کیونکہ سچ بہت کڑوا ہوتا ہے- ڈاکٹر غافر شہزاد کا معاملہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک سچ اس ناول میں بیان کر دیا ہے- جسے برداشت کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں ہے-
ناول کا واحد متکلم کردار اپنی زندگی کے تیس سال سرکاری دفتر میں گزارنے کے بعد ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ گیا ہے اوراس کا آج اس سرکاری دفتر میں آخری دن ہے- وہ گزرے تیس برسوں کو یاد کرتا ہے اورایک کیفیت میں ڈوب جاتا ہے- اسے اس بات کا شدید احساس ہے کہ آج کے بعد اس کا اس دفتر اور یہاں کی ہر شے سے تعلق اور اختیار ختم ہو جائے گا- اس کے متوازی انجینئر ارشاد علی، بڑے صاحب، ٹھیکیدار نصیر، ایس ڈی او و دیگر کردار چلتے ہیں جو اپنے اپنے دائرے میں اپنی حدود سے تجاوز کر کے اختیارات کے ناجائز استعمال سے مالی منفعت اٹھاتے ہیں، کئی سرکاری محکمے ان کی کرپشن کو روکنے کے لیے خود بھی کرپشن میں حصہ وصول کرتے ہیں، ناول کا واحد متکلم کردار کہ جو آرکیٹیکٹ ہے، اپنے تخلیقی فن کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا استغاثہ عدالت میں پیش کرتا ہے، اوراپنے لیے انصاف کے حصول کی خاطر خود دلائل دیتا ہے-
ناول ''استغاثہ'' میں فلیش بیک کی تکنیک کو برتا گیا ہے بلکہ پورا ناول اسی تکنیک کے سہارے آگے بڑھتا ہے- آرکیٹیکٹ کو یاد آتا ہے کہ وہ کس طرح اس محکمہ میں آیا- کس طرح فائلوں میں سے کرنسی نوٹ کا نکلنا اور کس طرح فائلوں کو چلایا جاتا ہے اور کس طرح ان فائلوں سے سرکاری ملازمین مال بناتے ہیں- ڈاکٹر غافر شہزاد نے فائلوں کو شطرنج کی بساط سے تعبیر کیا ہے- انجینئر اور ٹھیکیداروں کی ہیرا پھیریاں، افسران کے لیے حصہ نکالنا، ان کی بیگمات کے لیے مہنگے موبائل فونز لے کر دینا اور کس طرح بغیر منظوری کے کام مکمل کر لینا اور ٹھیکیدار نصیر کس طرح دربار نولکھ ہزاری شاہ کوٹ کے صحن میں زائرین کے لیے کمرے اور صحن میں سنگ مرمر لگاتا ہے اور محمد حسین سب انجینئر کے داماد کے لیے موٹر سائیکل لے کر دیتا ہے- سب کے سب بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے تھے- اپنے اپنے حصے کا مال بنانے میں لگے ہوئے تھے-
''استغاثہ'' کا دوسرا اہم کردار ارشاد علی ہے جو مولوی کرم علی کا بیٹا ہے- کرم علی گاؤں کی مسجد کا امام ہے- ارشاد علی کی چونکہ تربیت ایک ایسے دینی

ذوالفقار احسن

ماحول میں ہوئی ہے جہاں جائز کو جائز اور ناجائز کو ناجائز ہی سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ارشاد علی جب بطور انجینئر بھرتی ہوا تو بڑا خوش تھا۔ ارشاد علی نیکی اور اچھائی کا استعارہ ہے۔ سرکاری دفاتر میں سرکاری ملازمین چاہے وہ کسی بھی عہدے پر ہوں کرپشن، رشوت، ناانصافی ان کے خون میں سرایت کر چکی ہے۔ ایسے آرکیٹیکٹ کا وہاں موجود دیگر ملازمین کے ساتھ چلنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ کرپٹ لوگ کسی پارسا کو اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک نیک اور پارسا شخص ان کے کاموں میں رکاوٹ ڈالے گا لہٰذا سارے کے سارے اس کے خلاف سازشوں میں لگ جاتے ہیں۔ پہلے پہل تو اسے اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتے ہیں جب دیکھتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ چلنے والا نہیں ہے تو اسے راہ کا کانٹا سمجھنے لگتے ہیں۔

ناول نگار نے کرپٹ سرکاری ملازمین کے چہروں سے جو نقاب ہٹایا ہے وہ دراصل ناول نگار کے ضمیر کی آواز بھی ہے اسے یہ سب اچھا نہیں لگتا وہ سرکاری ملازمین کے رویوں سے نالاں ہے اسی لیے اس نے معاشرے کی ایک بھیانک تصویر ہمارے سامنے پیش کر دی ہے۔ وہ دراصل اصلاح کا خواہاں ہے اور مثبت سوچ رکھنے والا ایک ایسا ناول نگار ہے جو چاہتا ہے کہ دنیا اس کی سوچ کے مطابق ہو جائے۔ معاشرے میں پھیلی ہوئی کرپشن، ناانصافی، لالچ، طمع اور فریب سے نجات مل جائے۔ مگر ایسا ممکن نہیں ہے کیونکہ سرکاری دفاتر میں چھوٹے سے چھوٹے ملازم سے لے کر بڑے سے بڑا ملازم تک سبھی کرپشن میں ملوث ہیں اور پھر وہ ایک دوسرے کے تعاون کے بغیر ایسا نہیں کر سکتے۔ ہر سطح پر پیسہ چلتا ہے۔ سرکاری دفاتر میں ہونے والی سازشوں، تبادلوں، انکوائریوں کے بارے میں صحافیوں کے کردار کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے کہ وہ کس طرح مختلف دفتروں کی خبروں کو حاصل کرتے ہیں اور پھر سرکاری افسران کو بلیک میل کرتے ہوئے مال بناتے ہیں۔ بعض اوقات صحافی خود ہی مختلف سرکاری افسروں کے خلاف مقدمہ درج کرا دیتے ہیں اور پھر ان سے طرح طرح سے مال بٹورتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر غافر شہزاد نے اپنے عہد کے اس بدنما داغ کو معاشرے کے لیے سم قاتل قرار دیا ہے۔ ناول نگار نے انسان کی خود غرضی، حرص اور طمع کی حقیقی تصویر کو منشی پریم چند کے افسانے ''کفن'' کے دو مرکزی کرداروں گھیسو اور مادھو سے تعبیر کیا ہے۔

ناول کو فنی حوالے دیکھیں تو ناول نگار کا اسلوب نہایت سادہ اور رواں ہے۔ ناول کا پلاٹ مضبوط اور توانا ہے۔ ناول میں شعور کی رو کی تکنیک کو بھی برتا گیا ہے۔ ناول نگار نے کمال خوبصورتی کے ساتھ زبان و بیان کا بھی خیال رکھا ہے۔ ناول میں تشبیہات و استعارات کا استعمال بھی ملتا ہے اور اس کے ساتھ موقع کی مناسبت سے محاورات بھی برتے گئے ہیں۔ ناول میں برتی گئی چند تشبیہات ملاحظہ ہوں:

☆ ''اس کا رشتہ یہاں کے در و دیوار سے منقطع ہو جائے گا جیسے ماں کے پیٹ سے دنیا میں آنے والے بچے کا رشتہ آنول کٹنے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔''

☆ ''ایک عرصہ وہ یہی سوچتا رہا کہ یہ عمل کاغذ ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں، جیسے عدالتوں میں سائل جج کے سامنے خود حاضر ہوتے تھے ایسے ہی فائلیں اس کے دفتر میں حاضری کے لیے آتی تھیں۔''

☆ ''اس سے انسان میں نئی زندگی اور طراوت آجاتی ہے ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے انسان کے اندر سے ٹھہرے ہوئے پانی جیسی سڑاند اٹھنے لگتی ہے۔''

☆ ''بس یوں سمجھ لیجیے کہ دفتری کام کے ہونے اور نہ ہونے کے حوالے سے مجاز اتھارٹی کے اعتماد کی بحالی بہت لازم ہوتی ہے ایسی ہی مجبوریاں عدالت کو بھی درپیش ہوتی ہیں۔''

☆ ''سرکاری ٹھیکہ جات میں ٹھیکیدار کی حیثیت کمیٹی کے تل جیسی ہوتی ہے۔''

☆ ''ایمانداری اور دیانتداری کے سبب لوگ مجھ سے ڈرنے لگے تھے جیسے میں کوئی عفریت بن گیا تھا۔''

☆ ''خواجہ رمضان نے آکٹوپس کی طرح ٹھیکیدار نصیر کے گرد اپنا گھیراتنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔''

☆ ''نقشہ نویسی ایک خدائی کام ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بار بار کہا ہے کہ میں نے انسان کو اپنے ہاتھ سے بنایا۔''

ناول میں بعض جگہوں پر محاورات کا استعمال کر کے نثر کو خوبصورت اور اس میں فصاحت و بلاغت پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ناول میں ''رنگے ہاتھوں پکڑے جانا''، ''آدھا تیتر اور آدھا بٹیر''، ''پانی سر سے گزر جانا''، ''ڈھاک کے تین پات''، ''اس کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا تھا'' ''دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی'' جیسے محاورات ملتے ہیں۔ یہ محاورات اور تشبیہات دراصل نثر کے زیورات ہوتے ہیں جن سے نثر میں ایک حسن اور رعنائی در آتی ہے معانی میں بلاغت پیدا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر غافر شہزاد نے بھی ناول میں حسن پیدا کرنے کے لیے ان صنائع بدائع کا استعمال کیا ہے۔ جو ناول کی دلکشی و رعنائی میں بے پناہ اضافہ کر رہے ہیں۔ ہر دور کے چند نابغہ روزگار شخصیات نے اردو کی صحت لفظی کو درست بنانے میں اہم کردار ادا کیے ہیں۔ ناسخ نے بھی اردو کی زلفوں کو سنوارنے کے لیے کئی نئے الفاظ اردو میں شامل کیے اور بعض لفظوں کو غیر مستعمل قرار دیا تھا۔ ڈاکٹر غافر شہزاد کے ناول میں بھی کچھ ایسے الفاظ پڑھنے کو ملے ہیں جو عام طور پر پڑھنے کو نہیں ملتے مثلاً انھوں نے ایک لفظ تنخواہ، اُجرت، صلہ اور حوصلہ افزائی کے بدلے میں لفظ ''محنتانہ'' استعمال کیا ہے جو کہ بہت بھلا محسوس ہو رہا ہے۔ یہ کثیر المعانی جہات رکھتا ہے اور پڑھنے میں بھی بہت اچھا لگتا ہے۔

اکیسویں صدی کے ناول نگاروں میں شمس الرحمٰن فاروقی، مستنصر حسین تارڑ، مرزا اطہر بیگ، حسن منظر، محمد حمید شاہد، طاہرہ اقبال، حفیظ خان، اختر رضا سلیمی، محمد عاصم بٹ، ڈاکٹر حمیرا اشفاق، نسیم انجم، سعدیہ ہما شیخ، ڈاکٹر وحید احمد، صفدر زیدی اور ڈاکٹر غافر شہزاد ایسے ناول نگار ہیں جن کے ناولوں کے موضوعات میں تنوع ملتا ہے۔ یہ تمام ناول نگار فکری و فنی سطح پر ناول کے وقار میں اضافے کا باعث بن رہے ہیں۔ اس ضمن میں کیرن آرم سٹرونگ کا یہ بیان بھی سچ محسوس ہونے لگتا ہے کہ ''اکیسویں صدی میں تخلیقی اصناف میں اگر کچھ زندہ رہے گا تو وہ ناول ہوگا'' ڈاکٹر غافر شہزاد کے اس ناول نے سرکاری ملازمین کے اس رخ کو بے نقاب کیا ہے جو ہمیشہ مخفی چلا آ رہا تھا۔ ڈاکٹر غافر شہزاد کا ناول ''استغاثہ'' سوچ کے نئے در وا کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

عکس ہائے محبت و عقیدت

''میرے تحریر کردہ اظہاریے کے یہ عکس ہائے محبت و عقیدت اگر کسی درجے میں قبولیت کا اعزاز حاصل کر سکیں تو مجھے خوشی ہوگی''

یہ ہیں ڈاکٹر نثار ترابی جو اپنی کتاب ''تحقیق و تخلیقی زاویے'' میں ''حرفِ محبت'' کے عنوان سے اپنی اس شائع ہونے والی کتاب کی غرض و غایت کے بارے میں اظہارِ خیال کر رہے ہیں۔ راقمہ کو اس کتاب کے ستائیس مضامین پڑھنے کا شرف اور اعزاز حاصل ہوا اور گویا اس طرح کوچۂ ادب کے دلبراں کا دیدار نصیب ہوگیا۔ ''نعت دریچہ'' ایک تجزیاتی مطالعہ میں ڈاکٹر نثار ترابی نے ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان کی تخلیقی توانائیوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ نعت اور سیرت النبیؐ جیسے لامتناہی موضوع پر ایک تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ پیش کیا ہے۔ فطرت کے مصور اور فطرت سے محبت کرنے اور کروانے والے شاعر مجید امجد کی شاعری کا مصورانہ تجزیہ تحقیقی حوالوں کے ساتھ مرتب کر کے ڈاکٹر نثار ترابی نے شاعر کی عظمتوں کا اعتراف کیا ہے۔ انتظار حسین کی تنقید نگاری، افسانہ نگاری، علامتی انداز، المیاتی آہنگ اور دلکش اسلوب کا بیانیہ ڈاکٹر نثار ترابی نے مضمون ''انتظار حسین...... ایک اہم علامتی افسانہ نگار'' میں خالص تحقیقی بنیادوں پر استوار کر کے انتظار حسین کی مکمل ادبی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ ڈاکٹر نثار ترابی کا کمال فن یہ ہے کہ اگر وہ شوکت صدیقی کی ناول نگاری کی خصوصیات بیان کر رہے ہیں تو پڑھنے والوں کو ناول کے لفظی معنی، تعریف، آغاز و ارتقا اور اسلوب کے بارے میں بھی شعور دلاتے جاتے ہیں۔ عبداللہ حسین کے ناول ''نادار لوگ'' کا تنقیدی تجزیہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر نثار ترابی اس ناول اور ناول نگار کی ادبی اہمیت و افادیت اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

''اداریے کا قاسمی رنگ'' ایک ایسا مضمون ہے جس میں قاری کو اخبارات، اداریہ نویسی قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں اداریے کا ارتقا اور احمد ندیم قاسمی کی اداریہ نویسی اور مختلف رسائل و

راحیلہ خورشید

جرائد کے لیے ان کے کارہائے نمایاں کو مکمل ترتیب کے ساتھ تحریر کر کے محنت اور ریاضت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ سرگودھا کی دھرتی کے شاعر محترم جوہر نظامی کے حالات زندگی، ملازمت، شاعری، فن، اسلوب کی جدید کاوشوں، صوفیانہ رنگ، تصور حسن وعشق، طہارت فکر، دردِ انسانیت اور اساتذہ فن کے ساتھ تقابل کو شعری حوالوں سے مزین کر کے ایک خوب صورت تنقیدی مضمون تحریر کیا ہے۔ گیت کے آغاز، ارتقا، فلم اور تھیٹر میں گیت کی اثر پذیری منظور جھلا کا تعارف اور اس کے تحریر شدہ گیتوں کی فہرست جو مشہور گلوکاروں نے گائے تھے اور ان سب کے ساتھ ساتھ صفدر واثق کے حالات زندگی اور اُن کی منظور حسین جھلا کے فن اور شخصیت کے حوالے سے کیے گئے کام کو بھی تحقیقی انداز میں موثر اظہاریے کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نثار ترابی نے ''فتح محمد ملک ---ادب میں فتح مندی کا امتیازی نشان'' تحریر کر کے نہ صرف ایک معتبر اور صاحب اسلوب نظریاتی ناقد کے فن کو سراہا ہے بلکہ اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر روبینہ شاہین نے مظفر علی سید کی شخصیت، فن اور تنقید کے میدان میں اُن کی خدمات پر پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیقی مقالہ لکھا جو بعد میں کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر نثار ترابی نے اپنے مضمون میں اس کام کو ایسے سمیٹا ہے کہ مظفر علی سید کی خصوصیات اور ڈاکٹر روبینہ شاہین کی محققانہ صلاحیتیں دونوں ساتھ ساتھ اجاگر ہو رہی ہیں۔ ظریفانہ اردو شاعری کے گلدستے سجانے والے اسد جعفری کی سنجیدہ شاعری، ندرتِ خیال اور زبان و بیان کی فنی پختہ کاری کی عکاسی ڈاکٹر نثار ترابی نے شعری حوالوں کے ساتھ کی ہے۔ ڈاکٹر نثار ترابی نے ڈاکٹر عطش درانی کی ادبی خدمات کا محاکمہ اور زبان و ادب میں ان کے کارہائے نمایاں کو نمایاں کر کے ان کا شمار ہمہ جہت اور منفرد ادبی شخصیات میں کیا ہے۔ ڈاکٹر نثار ترابی نے جبار مرزا کی کہانی ''پہل اس نے کی تھی'' کا تنقیدی تجزیہ تاثراتی اظہاریے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر منور راہی کو ڈاکٹر نثار ترابی نے تخلیقی شاعری کی منور راہوں کا راہی اور انسان دوست قدروں کا ترجمان قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر منور راہی کی غزلوں اور نعتوں کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ غزل گو شاعر شاداب احسانی کی انفرادی حیثیت کو تنقیدی نظریوں سے ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ سفرنامے کے فن، ارتقا اور خصوصیات پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد کامران کے سفری احوال ''گ سے گڑیا، ج سے جاپانی'' کی انفرادیت اور امتیازی گوشوں کو عیاں کیا ہے۔ ڈاکٹر نثار ترابی کا تنقیدی میلان خالص تحقیقی نوعیت کا ہے۔ وہ اپنی تنقید کی بنیاد تحقیقی حوالوں پر استوار کر کے درست ترین رائے اور تاثر تک خود پہنچتے اور قاری کو پہنچانے کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کا ہر مضمون اور بالخصوص فرخ راجا کے شعری مجموعے ''ہوا کا سمندر'' ان کے تنقیدی نظریے کا بھرپور غماز ہے۔ تخلیق، تنقید اور تحقیق الگ الگ

اسلوب کے متقاضی ہیں۔ڈاکٹر نثار ترابی کے اسلوب میں یہ انفرادیت ہے کہ وہ ایک خوب صورت بیانیہ رکھتے ہیں اور دلکش اندازِ بیان میں بلا کی استدلالی اور منطقی ترتیب سے اثر آفرینی کا دلکش ماحول تخلیق کرتے جاتے ہیں۔اظہر غوری کی نثری نظموں کی خصوصیات اور انفرادیت کا تعین کرتے ہوئے ڈاکٹر نثار ترابی کا اسلوب بے مثل دلیل بن کر تحسین سمیٹنے کا حق دار بنا ہوا ہے۔''کنارِ خواب'' کا تشنہ مسافر کے عنوان سے ڈاکٹر نذر عابد کی شاعری ،فکری رویوں، موضوعات اور فنی معیاریت کا بھرپور جائزہ پیش کیا گیا ہے۔حمید قیصر کی افسانہ نگاری کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر نثار ترابی نے افسانے کی روایت اور موضوعات پر بھی تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کی تخلیق کردہ مثنوی ''کتاب نامہ'' کا تنقیدی اور تحقیقی تجزیہ پیش کر کے ڈاکٹر نثار ترابی نے خود کو ایک منفرد نقاد کے مقام پر ثابت کیا ہے،اسی مضمون میں نقاد نے مثنوی کی تعریف اور مختصر روایت پر بحث کر کے قارئین کے لیے علمی معلومات کا خزینہ جاری کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے نثری اور شعری ادب کی ہر صنف سے تعلق رکھنے والے فنکاروں اور فن پاروں کو احاطہ تحریر میں لانے کے ساتھ ساتھ اس صنف کے بارے میں مختصر مگر جامع معلومات بھی فراہم کی ہیں۔''سفرنامہ کو سو میں ایک سال'' کا احوال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ سفرنامہ کے فنی لوازمات اور اردو سفرنامے کی روایت پر بھی بات کر گئے ہیں۔یوں ان کا تقریباً ہر مضمون ہی دو طرح سے معلومات کا سرمایہ ثابت ہو رہا ہے۔یہی کیفیت ڈاکٹر سلمان علی کی سفری یادداشت ''اے تشنۂ ظہور'' کا جائزہ پیش کرتے ہوئے بھی دکھائی دے رہی ہے۔

اختر رضا سلیمی کے ناول ''جاگے ہیں خواب میں'' کے جملہ فنی پہلوؤں کو الگ الگ کر کے حوالوں کے ساتھ واضح کیا ہے۔نعمان منظور کی کتاب ''مخطوطِ نم'' پر پیش کیا گیا ایک دلچسپ تجزیاتی تاثر واقعی قارئین کے لیے انوکھا ہے کہ یہ تجزیہ ان ذاتی خطوط کا ہے جو نعمان منظور نے خالد احمد کو ان کی وفات کے بعد لکھے۔چین کے مشہور زمانہ ناول ''تین سلطنتوں کی داستان'' کا ترجمہ اردو زبان میں ڈاکٹر ظہور احمد نے کیا۔ڈاکٹر نثار ترابی نے نہ صرف اس ناول کا تعارف اور پس منظر پیش کیا ہے بلکہ چینی روایات اور پاک چائنہ دوستی پر بھی اپنا اظہاریہ پیش کیا ہے اور کتاب کے آخر میں فنِ تدوین کے مسائل،نزاکتوں اور حد بندیوں کا تعین تنقیدی و تحقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر نثار ترابی نے اس تحقیقی کام کو کامل محققانہ دیانت داری سے پیش کیا ہے۔اس کتاب کا علمی و ادبی استحقاق تو یہ ہے کہ ڈاکٹر نثار ترابی کو ایک قابلِ قدر تخلیق کار،نقاد اور محقق تسلیم کیا جائے۔اس کتاب کی کامیاب اشاعت اور عوام و خواص میں پذیرائی پر ڈاکٹر نثار ترابی کو مبارک باد پیش کی جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆

”مزدور شاعر کی چیتر رُت“

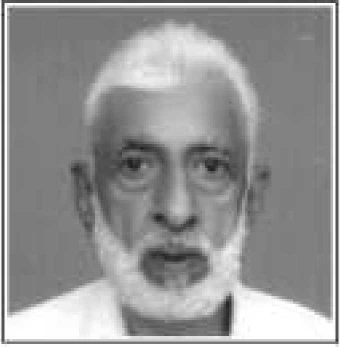

شاعری حقیقت میں ایک مشکل فن ہے، جس کو مطالعہ کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر رتجگوں کے اندھیروں سے نکل کر، سورج کی تیز شعاعوں کی تپش محسوس کر کے، مشاہدے کی بھٹی میں ڈھل کر، اپنے اردگرد کے ماحول کو شعور کی عینک لگا کر بغور پرکھنے کے بعد ہی حاصل کیا جا سکتا ہے- یوں تو ہر لکھنے والے کی خواہشِ اوّلیں یہی ہوتی ہے کہ وہ جلد از جلد ادبی دنیا میں صاحبِ کتاب ہو جائے تاکہ اُس کے اندر کا فنکار اُبھر کر اپنے فن کے جوہر دکھا سکے - سمجھدار شاعر، ادیب پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے اپنی منزل کی طرف گامزن رہتے ہیں اُن کو شہرت کی لالچ نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کی اچھی تربیت کی فکر ہوتی ہے اپنے ہم عصروں سے داد و تحسین وصول کرنا مشکل نہیں ہاں مگر اپنے پیچھے آنے والے قافلے کے لیے رہنما بننا جان جوکھوں کا کام ہے-

ہمایوں پرویز شاہد اردو، پنجابی ادب میں اپنا ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں- دونوں زبانوں میں یکسانیت سے لکھنا اور اپنے لکھے پر ادب پروروں سے شاباش کے ہار اپنے گلے پہننا کسی بھی بڑے اعزاز سے کم نہیں- ہمایوں پرویز شاہد نے اب تک دونوں زبانوں میں تقریباً 11 کتب ادب کو دان کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ محنت کرے انسان تو کیا نہیں کر سکتا- سارا دِن لاہور جیسے پُر رونق شہر کی مارکیٹوں میں پیدل سفر کر کے اپنے گھر والوں کا پیٹ پالنے کے لیے اخبار بیچنا اور پھر رات کو دِل کی تشنگی دُور کرنے کے لیے ادب کی شمع جلا کر ذہن کے کوزے سے چمکتے دمکتے الفاظ کا چناؤ کر کے حمد، نعت، منقبت، سلام، غزل، نظم، گیت، رباعی، قطعہ، صفحۂ قرطاس پر تحریر کرنا ایسے ہی ہے جیسے جس

عقیل شافی

کے موسم میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا کیونکہ سارے دن کی تھکن مزدور کو چکنا چور کر دیتی مگر جب مزدور شاعر "چیتر رُت" کی آس لگائے اپنے اردگرد کے ماحول کو خوشحالی میں ہرا بھرا دیکھتا ہے تو اُس کی تھکاوٹ، تھکاوٹ نہیں بلکہ کامیابی کا سنگِ میل بن جاتی ہے۔

"چیتر رُت" ہمایوں پرویز شاہد کا بارھواں شعری مجموعہ ہے اس سے پہلے "شوق سفر دا"، "ست زمیناں ست اسمان"، "دل دے چھالے"، "چیوندی جاگدی غزل"، "دیوے بال دروواں دے"، "نعت عبادت میری اے"، "عطا فر نعت ہوئی اے"، جیسی شاہکار کتابیں ماں بولی پنجابی کو دان کر چکے ہیں۔

نعت اور غزل کے بعد "چیتر رُت" اِن کا پہلا نظمیہ مجموعہ ہے، جس میں ماضی اور حال کے بیتے لمحات کو شعری لبادہ پہنا کر خوبصورت الفاظ کی اوڑھنی میں اوڑھ کر پنجابی ادب میں انمول اضافہ کیا ہے۔ پہلے صفحے سے لے کر آخری سطروں تک "چیتر رُت" قاری کو اپنے حصار میں یوں رکھتی ہے جیسے چاند کے گرد ہالا اور میرے ناقص تجربے کے مطابق یہی ایک کامیاب شاعر کی نشانی ہے قاری جیسے جیسے کلام پڑھتا ہے وہ تخیلاتی طور پر مصرعوں کے ساتھ جھومتا ورق گردانی کرتا اُوریت سے دور قوسِ قزح کی پینگھ میں ہلارے لیتا پریوں کے دیس میں "چیتر رُت" کے مزے لیتا اپنے ذہن و قلب کو معطر کرتا آخرکار اُس چیز کو حاصل کرتا ہے، جس کا وہ متلاشی ہوتا ہے۔

"چیتر رُت" میں دھرتی دا قرض، زہریلے سپ، جنت دا دروازہ، دھی نمانی، لوڈشیڈنگ، ننھی زینب نوں انصاف دواواں گا، فیصلہ تہاڈے ہتھ اے لوکو، ورھا، اُدھار، بکرا عید، جیوے ساڈا پاکستان ایسی نظمیں ہیں جن کو پڑھ کر درد دل رکھنے والا اپنی سکت کے مطابق خود سے وعدہ کرتا ہے کہ میں بھی ان شاء اللہ اپنی زندگی میں کچھ ایسا اچھا کر جاؤں گا کہ لوگ جانے کے بعد اچھے الفاظ سے یاد کریں گے۔ اچھی بات بھی صدقۂ جاریہ ہوتی ہے چاہے وہ نثر میں کی جائے یا اشعار میں۔ آنے والا وقت ہی فیصلہ کرتا ہے کہ کون کیا کر گیا۔

ہمایوں پرویز شاہد کے ہاں ردیف، قافیے، استعارے، کنائے، تشبیہات، الفاظ کا ذخیرہ اس قدر موجود ہے کہ ان کے لیے شعر کہنا مشکل نہیں جب چاہے، جیسے چاہے، جس صنف میں چاہے اپنے قلم کا رُخ موڑ کر اپنے فن کے جوہر دکھا کر میدانِ ادب میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیتے ہیں۔ یہ سارا فیض جدید پنجابی غزل کے سپہ سالار جناب استاد منظور وزیر آبادی کا ہے کہ آج ہمایوں سینئر شعرا کرام کی پہلی صف میں کھڑے اپنا ادبی فرض، قرض سمجھ کر ادا کر رہے ہیں میری دعا ہے اللہ کریم، قرآن کریم، نبی کریم ﷺ کے صدقے ان کے قلم میں روانی، تندرستی والی زندگانی، محبِ وطن پاکستانی ہونے پر مزید آسانیاں عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

☆☆☆☆☆

آپشن

سلمیٰ اعوان

یہ رشتہ کیا آیا تھا حمیدہ بیگم کے لئے سوچوں کا دروازہ کھُل گیا تھا۔ ظفر احمد رشتے میں اس کا بھتیجا لگتا تھا۔ اُونچا لمبا، خوبصورت، چھوٹے سے ذاتی کاروبار پر کھڑا۔ پھر کوئی غیریت نہیں تھی رشتے داری تھی پر ایک جھج سی بھی چمٹی ہوئی تھی ساتھ جیسے گلاب کے پھول کے ساتھ کانٹے ہوتے ہیں۔

بائیں ہاتھ کی چار اُنگلیاں پیدائشی غائب تھیں۔ بس یہی وہ سوچ تھی جس نے حمیدہ بیگم کو اُلجھن میں ڈالا ہوا تھا۔ پانچ بھائیوں کی لاڈلی دو بہنیں تھیں اس کی بیٹیاں۔ صورت میں اچھی پر سلیقے میں بہت اُونچی۔ یوں بھی ان دِنوں حمیدہ کی نظریں اپنے حقیقی بھانجے پر تھیں۔ قرائن سے لگتا تھا کہ وہ بھی نسیمہ میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ظفر کی ماں اس کی رشتے میں بھاوج تھی اور وہ ان دِنوں ان کے گھر ڈیرہ ڈالے بیٹھی تھی۔ اس نے تو بغیر کِسی لگی لپٹی کے کہہ دیا تھا۔

”دیکھو حمیدہ، نسیمہ کا رشتہ لئے بغیر میں نہیں ٹلوں گی۔ بس مجھے خالی ہاتھ نہیں لوٹانا۔“

”ارے دیکھو نا بھابی، بڑے لڑکوں کو آنے دو۔ ان سے مشورہ تو ضروری ہے۔ سائیں سر پر ہو تو عورت من مانی کر سکتی ہے، پر رنڈی عورت بیٹوں کی محتاج ہوتی ہے۔ آپ مجھے تھوڑا سا وقت تو دیں نا۔“

ظفر کی ماں مُصر تھی۔ حمیدہ بیگم نے ایک دو بار دبے لفظوں میں اس کے ہاتھ کا بھی تذکرہ کر دیا تھا اور بھاوج نے یوں اُچھل کر کہ جیسے بچھو نے ڈنگ مار دیا ہو کہا۔

"ارے خدا سے ڈرو بیبی کوئی دیر لگتی ہے اُوپر والے کو ٹانگنے میں۔ اس کا یہ کون سا عیب ہے۔ خاندانی، ماشاء اللہ سے خوبصورت، اپنا ذاتی کاروبار بے شک ابھی چھوٹا سا ہے پر آگے بڑھنے کا امکان تو ہے۔

حمیدہ بیگم نے اس کے تین دن رہنے اور بے شمار منتیں کرنے پر بھی رشتے کے لئے حامی نہیں بھری تھی۔ بس بیٹوں کی آڑ لیتی رہی۔ نتیجتاً چوتھے دن وہ مایوس سی گھر لوٹ آئی۔ بیٹے کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کے بائیں ہاتھ کو چومتے ہوئے وہ نم آنکھوں سے بولی۔

"پُتر بس تیرا یہ ہاتھ تیرا عیب بن گیا ہے۔ بے شک حمیدہ نے کُھل کر نہیں کہا پر بیٹا میں نے یہ چونڈہ اب دھوپ میں تو سفید کیا نہیں۔"

اس نے بہت لمبی سانس بھری۔ پھر گُم سُم پلنگ پر بیٹھے بیٹے کو دیکھا اور بولی۔

"تُو کیوں دل ہلکا کرتا ہے؟ تیرے لئے رشتوں کی کیا کمی؟ بس مجھے حمیدہ کی لڑکی یوں بہت پسند تھی کہ وہ سلیقہ مند ہے۔ پر خیر اچھی لڑکیوں کا کوئی کال نہیں۔ تیرے لئے میں زمین آسمان ایک کر دوں گی اور ایسی لڑکی لاؤں گی کہ حمیدہ بیگم ایک بار تو دل میں کہے گی کہ یہی وہ لڑکا ہے جسے میں نے دھتکارا تھا۔"

ظفر احمد بہت حساس نوجوان تھا۔ اس نے نسیمہ کو ایک بار کہیں شادی میں دیکھا تھا۔ بس اچھی تھی۔ اس کی ماں نے جب اس سے شادی کے بارے میں پوچھا اور نسیمہ کا نام لیا تو وہ بولا۔

"اماں آپ بہتر سمجھتی ہیں۔ میں کیا کہوں؟"

لیکن اُسے اس بات کا ایک فی صد بھی گمان نہیں تھا کہ اس کا ہاتھ اس کے لئے اتنی بڑی گالی بن جائے گا اور اس کی ہر خوبی اس معمولی سے کج کے آگے ماند پڑ جائے گی۔ اُسے یوں لگا جیسے چلتے چلتے لمبی نوکیلی سولوں نے تلووں کو زخمی کر دیا ہے۔ چبھن اور کسک ہلکان کیے دے رہی تھی۔

اماں کو بھی ایک ضد سی ہو گئی تھی۔ ساری برادری کے گھروں کو چھان مارا تھا اور پھر نائلہ کو کھوج لائی جو چندے آفتاب اور چندے ماہتاب تھی۔ سچی بات ہے کہ اس نے گھونگھٹ اُٹھایا اور اُسے دیکھ کر اپنے مقدر پر آپ رشک کیا۔ پر وہ کٹی انگلیوں والا ہاتھ بس چھپاتا پھرا۔ چند دنوں بعد ایک دن اس نے نائلہ سے کہا۔

"تمہیں میرا یہ ہاتھ بدنما تو نہیں لگتا۔"

"میں نے اس پر کبھی غور نہیں کیا۔" عجیب سی شان بے نیازی تھی اُس کے انداز میں۔ پر چند دنوں میں ہی اُسے احساس ہو گیا کہ وہ

شکل و صورت کے معاملے میں جتنی امیر ہے ذہن کے معاملے میں اتنی ہی غریب ہے۔ لمبی چوڑی سوچ تھی ہی نہیں اُس کے پاس۔ بس اچھا کھاتی اچھا پہنتی اور خوب سوتی۔

ان دنوں ابھی وہ اسے اپنے ساتھ نہیں لایا تھا۔ وہ اس کے گھر والوں کے پاس ہی رہتی تھی۔ ویک اینڈ پر وہ گھر چلا جاتا۔ نئی نویلی دلہنوں والا تپاک اس میں نظر نہ آتا۔ وہ کہیں آنگن میں یا اس کی کسی بہن بھاوج کے ساتھ باتوں میں مصروف یا اپنے کمرے میں سو رہی ہوتی۔ اُسے دیکھ کر مُسکراتی ضرور پر انداز میں والہانہ پن، اُس سے دُور رہنے پر محبت بھری خفگی کا اظہار قطعی مفقود ہوتا۔

اس کا جی چاہتا وہ پوچھے کہ تمہیں معلوم نہیں تھا کہ آج میں نے آنا ہے۔ تمہیں میرا انتظار نہیں تھا۔ تم نے کمرہ بھی اہتمام سے نہیں سنوارا۔ کیا تم مجھے پُرتپاک انداز میں خوش آمدید نہیں کہنا چاہتی تھیں۔

پر وہ یہ سب چاہتے ہوئے بھی نہ پوچھ پاتا۔ یوں جب وہ اس کے گلے لگتی اور پیار بھری باتیں کرتی۔ اُسے ہنس ہنس کر ہفتے بھر کے قصے کہانیاں سُناتی تب وہ ہر تلخی بھول جاتا۔ محبت سے اُس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں تھام کر کہتا۔

”بس میں مکان کی تلاش میں ہوں۔ جوں ہی مجھے ملا تم میرے پاس ہوگی۔“

ماں نے اس کے کانوں میں یہ ڈالنے کی کوشش کی تھی کہ وہ اُسے زیادہ ڈھیل نہ دے۔ وہ ان عورتوں میں سے نہیں ہے جو مردوں کی خون پسینے کی کمائی سینت سینت کر گھر بناتی ہیں، بلکہ یہ عورتوں کی وہ قسم ہے جو گھر میں رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو سرائے میں بیٹھا سمجھتی ہیں۔ زبان کا چٹخارہ اور آرام طلبی انھیں مرد کی محنت کی کمائی کی قدر کرنا نہیں سِکھاتی، بلکہ وہ اُجاڑنے کا باعث بنتی ہیں۔ ماں اس کے پھوہڑپن سے بھی نالاں تھی۔

وہ ان باتوں کا اتنا نوٹس نہیں لے رہا تھا کیونکہ ابھی وہ دال روٹی کے بھاؤ میں نہیں پڑا تھا اور یوں بھی نیا نویلا عشق تھا۔ ویسے ماں کی اس بات سے وہ سو فی صد متفق ہو چکا تھا کہ اُس میں سلیقہ، طریقہ نام کو نہیں۔

جب اسے رہائش کے قابل گھر مل گیا وہ نائلہ کو اپنے پاس لے آیا۔ نئے گھر میں آ کر اس نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو جان اتنے عرصے میں شاید تمہیں میری طبیعت کا کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا۔ میں نفاست پسند ہوں۔ روزمرہ کی اشیاء کا یہاں وہاں پھیلاؤ اور بکھراؤ مجھے پسند نہیں۔ زندگی میں نظم و ضبط کے اصول اپناؤ۔ تمہارے وقت اور محنت دونوں کی بچت ہوگی۔“

مگر وہ بھی اپنی عادت سے مجبور تھی۔ وہ تو ناشتہ چھوڑ کھانے بھی بازار کے چاہتی تھی۔ چند دنوں تک وہ اس کے ناز اُٹھاتا رہا۔ ایک دن کہہ بیٹھا۔

"نائلہ گھرداری کو اچھے طریقے سے چلاؤ۔ بازار کے مسالوں والے کھانے کھا کھا کر تنگ آ گیا ہوں۔ میرا معدہ ٹھیک نہیں رہا۔"

دو سال تک یہ گاڑی چلتی رہی۔ نائلہ بیوقوف بیوی تھی، پھوہڑ تھی۔ حُسن پاس تھا پر اس خزانے سے یکسر لاعلم تھی۔ بچہ بھی ابھی تک نہیں تھا۔ اس سے زبانی کلامی پیار کا اظہار کرتی پر جان کو تکلیف دینے کے لئے تیار نہیں تھی۔ وہ سو رہی ہوتی اور ظفر خود ہی دودھ گرم کر کے ناشتہ بناتا اور کھا کر چلا جاتا۔ وہ اُٹھتی اور غصے سے ناشتہ کرتی۔ اس کے دل میں کبھی کبھی تاسف پیدا ہوتا سوچتی کہ اُسے صبح اُٹھ کر ظفر کو ناشتہ خود دینا چاہیے۔ اگر ظفر کبھی کہہ دیتا تو جھٹ آگے سے کہہ دیتی۔

"تو تم مجھے اُٹھا دیا کرو نا۔ اس میں آخر کیا بُرائی ہے؟"

مگر ظفر کو یہ پسند نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بیوی کو اتنا ذمہ دار ہونا چاہیے کہ اس کی آنکھ شوہر کو وقت پر ناشتہ دینے کے لئے خود کھلے نا کہ اُسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھایا جائے۔ وہ آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھے اور منہ بسورتی ہوئی ناشتہ بنائے۔

اب یہ کیسا اتفاق تھا کہ وہ ایک دن بازار میں سے گزر رہا تھا کہ اس نے حمیدہ بیگم کو دیکھا جس کے ساتھ ان کی چھوٹی بیٹی تھی۔ ماں بیٹی کے ہاتھوں میں پکڑے لفافے بتاتے تھے کہ دونوں لمبی چوڑی خریداری میں مصروف ہیں۔ ظفر کے دل میں چُبھی پھانس جو وقت کے ہاتھوں مندمل سی ہو چکی تھی ایک بار پھر انہیں دیکھ کر ٹیس دینے لگی۔ اس نے کنی کترا کر نکل جانا چاہا پر حمیدہ بیگم نے اُسے دیکھ لیا تھا۔ وہ تو لپک کر اس کے پاس آئی۔ اُسے بازو سے تھام لیا اور شوق سے سب کا حال احوال پوچھنے لگی۔

"ارے تم یہاں کیسے؟ گھر میں سب ٹھیک تو ہیں۔ بھابی کی صحت ٹھیک رہتی ہے؟ دیکھو ظفر رشتے ناطے تو اللہ کے اختیار کی بات ہے۔ انہیں مجھ سے بہت شکایت ہے۔ انہوں نے مجھ سے ملنا چھوڑ دیا ہے۔ کبھی نہیں آئیں۔"

ظفر کا جی چاہا کہ ایسی کھری کھری سنائے کہ حمیدہ بیگم کو احساس ہو کہ اس نے اُسے کتنا زخمی کیا ہے؟ پر اس کی طبیعت میں شروع ہی سے رواداری اور لحاظ تھا۔ وہ چپ چاپ کھڑا ان کی باتیں سنتا رہا۔ اب وہ اُس سے پوچھ رہی تھی کہ وہ کیا کام کرتا ہے؟ کہاں رہتا ہے اور یہ کہ اس کے کتنے بچے ہیں؟

اس نے اپنے بارے میں تفصیلی بتایا۔ اپنے کاروبار کا ذکر بھی خوب کیا۔ ایک پچھتاوا دینا مقصد تھا۔ اپنی تسکین تھی کہ اُسے رد کرنا کتنی بڑی غلطی تھی اور یہ بھی جتلانا تھا کہ دیکھو وہ انسان کاروباری صف میں کھڑا ہو کر کیسا قد آور ہو گیا ہے؟

حمیدہ بیگم نے اُسے گھر چلنے کو کہا مگر اس نے شائستگی سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''اس وقت مجھے کام ہے میں نائلہ کے ساتھ پھر کسی وقت حاضر ہوں گا۔'' گھر کا پتہ اُس نے سمجھا اور رخصت ہوا۔

''ضرور آنا میں انتظار کروں گی۔'' حمیدہ بیگم نے آگے بڑھ کر پھر رُخ موڑتے ہوئے تاکید کی۔

کتنے دنوں بعد ایک دن شام کے وقت نائلہ کے ساتھ وہ اُن کے گھر گیا۔ نائلہ کو بہترین لباس اُس نے پہننے کو کہا اور خود بھی بہت اچھی طرح نک سک سے آراستہ ہوا۔

یہ ایک کشادہ سا سیمنٹ کا بنا ہوا کوٹھی نما مکان تھا۔ یہ گھر حمیدہ بیگم نے کوئی دو سال ہوئے خریدا تھا۔ وہ گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ تو سُرخ چہچہاتے گملوں میں کھلے پھولوں نے اُس کا استقبال کیا۔ برآمدہ یوں لشکارے مارتا تھا کہ پلیٹ نہ ملے تو چاول فرش پر ڈال کر کھالو جیسے محاورے کی سچائی یاد آ گئی تھی۔

بیل Bell کی آواز پر حمیدہ بیگم باہر آئی۔ اُسے دیکھا خوش ہوئی۔ نسیمہ شمیمہ بھی آ گئیں۔ بڑا پُرتپاک خیر مقدم ہوا۔ دونوں میاں بیوی کو لے کر وہ لوگ بڑے کمرے میں آ گئے۔ بیٹھنے کے ساتھ ظفر کو احساس ہوا تھا کہ ایسا صاف ستھرا اور رکھ رکھاؤ والا گھر اس نے کہیں نہیں دیکھا۔ یہ ٹی روم تھا۔ دیواروں پر منی پلانٹ کی بیلیں سجی ہوئی تھیں۔ کمرے کا رنگ و روغن، صوفوں، پردوں اور میٹ کے رنگ آپس میں خوبصورت امتزاج کے حامل تھے۔

اس کی بیوی کے حُسن سے وہ سب بہت متاثر ہوئے تھے۔ نسیمہ کو اُس نے بغور دیکھا تھا وہ قبول صورت تھی۔ اس کی بیوی کے تو پاپاسنگ بھی نہ تھی۔

چائے آئی۔ چائے پیش کرنے کا سلیقہ، کھانے پینے کی چیزیں، کٹلری اور برتن سبھی اعلیٰ تھے۔ وہ جب ہاتھ دھونے کے لئے باہر آنگن میں آیا۔ صحن کے ایک طرف واش بیسن، اس پر رکھا صابن، سٹینڈ پر ٹنگا تولیہ سب چیزیں چم چم کرتی تھیں۔

اس کے دل سے اک ہوک سی اُٹھی اور سارے سریر میں پھنکارتی ہوئی لبوں پر آکر دم توڑ گئی۔ اس نے ایسا گھر چاہا تھا۔ ایسی بیوی کی تمنا کی تھی۔ حُسن کے جلوے نظروں کو خیرہ ضرور کرتے ہیں پر ان کی مدت بہت عارضی ہوتی ہے۔ ان جلوؤں کے ساتھ اگر سیرت کی بنیادی خوبیاں نہ ہوں تو ہر شے زہر لگنے لگتی ہے۔

ایک دو ملاقاتوں کے بعد نسیمہ کے بارے میں حمیدہ بیگم نے خود ہی بات کی تھی کہ وہ اس کے رشتے کے لئے پریشان ہے۔ بہن نے تو پرواہ بھی نہیں کی۔ بیٹے کا بیاہ بہت اُونچی جگہ کر لیا۔ یہ بھی کہا کہ ظفر کسی اچھے لڑکے کا خیال رکھنا۔ یہ سب سُن کر اس کے تپتے ہوئے اندر جیسے برف اُتر گئی۔ سارے بدن میں ٹھنڈ اور سکون دوڑ گیا تھا۔

''تب تو ہوا میں تلواریں مارتی تھی۔ اب چکھو مزہ۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔

اب دونوں گھروں میں آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ ایک دفعہ وہ گاؤں بڑے بھائی سے ملنے گیا۔ نائلہ کو چھوڑ گیا۔ حمیدہ بیگم کو جاتے ہوئے تاکید کرتا گیا کہ وہ اس کا خیال رکھے۔ جب چار دنوں بعد آیا تو گھر میں داخل ہوتے ہی اسے احساس ہوا کہ اس کا وہ کاٹھ کباڑ والا گھر چمک رہا ہے۔ اس نے ایک ایک شے کو غور سے دیکھا اور نائلہ سے پوچھا۔

''یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا؟''

اور وہ بھی ہنستے ہوئے بولی۔

''ارے ساری کارستانی نسیمہ اور شمیمہ کی ہے۔ دو دن رہیں۔ میں نے تو بہتیرا منع کیا مگر جب تک گھر ٹھیک نہیں کر لیا بیٹھی نہیں۔''

''دیکھو نائلہ تم بھی ایسے ہی گھر کو صاف رکھا کرو۔ مجھے صاف گھر بہت اچھا لگتا ہے۔''

''اچھا اب کوشش کروں گی۔''

جواب میں کوفت اور بے زاری کی صاف جھلک تھی۔

نائلہ کا باپ بیمار تھا وہ اُسے دیکھنے جانا چاہتی تھی۔ اس نے گاؤں سے چھوٹے بھائی کو بلایا اور اس کے ساتھ اُسے بھیج دیا۔ نائلہ کی عدم موجودگی میں حمیدہ بیگم نے اُسے خود کہا تھا کہ وہ کسی قسم کی غیریت نہ برتے اور ان کے گھر کھانا کھائے۔ آخر رشتہ داریاں ایسے ہی دُکھ سُکھ کے لئے تو ہوتی ہیں۔ اس نے شروع میں تو ذرا تکلف سے کام لینا ضروری سمجھا مگر حمیدہ بیگم کے پُرخلوص اور چاہت بھرے اصرار پر آمادہ ہو گیا۔

اس گھر میں کھانا کھا کر عجیب سی سرشاری کا احساس ہوتا تھا جیسے آدمی کی روح خوشیوں اور مسرتوں کے پاتال میں گھومتی پھرے۔ جیسے وہ سارے غموں سے آزاد ہو۔ آٹھ بجے سب کھانا کھاتے تھے۔ دسترخوان بچھ جاتا۔ گرم برتن، گرم گرم بھاپ اور خوشبوئیں اُڑاتا کھانا۔ روز وہ جاتے ہوئے موسمی پھلوں کا لفافہ لے جاتا۔ حمیدہ بیگم نے اس کی اس حرکت کا بُرا منایا۔ اس نے آہستگی سے کہا۔

''اگر آپ ایسا کریں گی تو میں کھانا کھانے نہیں آؤں گا۔''

نسیمہ بہت کم گفتگو میں حصہ لیتی تھی پر اس وقت تیزی سے بولی۔

''تو گویا آپ بدلہ اُتارتے ہیں۔''

اس نے نگاہیں اُٹھائیں۔ اپنے سامنے بیٹھی نسیمہ کو دیکھا اور حسرت زدہ لہجہ میں بولا۔

''کاش اُتار سکتا۔''

حمیدہ بیگم کے پلّے تو پتہ نہیں کچھ پڑا یا نہیں پر نسیمہ کی آنکھیں ان نگاہوں کی تاب نہ لاسکیں اور فوراً جھک گئیں۔

پھر ایک دن اپنی ماں کے سامنے جیسے وہ پھٹ پڑا۔

''ماں وہ لڑکی ہے کہ گنوں کی تھیلی۔ ان کے گھر کے اندر داخل ہوتے ہی آپکی ساری کلفتیں، آپکی کاروباری اُلجھنیں، آپکی تلخ سوچیں یوں اُڑنچھو ہو جاتی ہیں جیسے کسی

نے پل جھپکتے میں جادو کی چھڑی پھیر کر آپ کے مسائل کی سیاہی کو بلاٹنگ پیپر کی طرح چوس لیا ہے۔ جیسے کسی معمے میں پھنسے ذہن میں ایکا ایکی مسئلے کے حل کا بٹن دب جائے اور کمرہ روشن ہو جائے۔

ماں نے سر یوں جھکایا تھا جیسے مراقبے میں چلی گئی ہو۔ نائلہ کے لچھنوں سے وہ کوئی ناواقف نہ تھی۔ دیے کی اس لاٹ جیسی کی کھوپڑی میں پیدا کرنے والا شاید بھیجا ڈالنا بھول ہی گیا تھا۔ کوئی ایک بار تھوڑی بیسویں بار تیری میری مثالوں سے اُس نے اس کے کانوں اور دماغ کی کھڑکیاں کھولنے کی کوشش کی تھی۔ پر وہاں وہ مثال تھی۔ سنو ایک کان سے، اُڑا دو دوسرے کان سے۔ زندگی کا فارمولا شاید یہی تھا اس کے نزدیک۔ کھاؤ پیو، پہنو، اوڑھو، موجیں مارو اور سرہانے بازو رکھ کر سو جاؤ۔ نہ کوئی سوچ، نہ کوئی چنتا، ہر سُو راوی کا چین ہی چین تحریر تھا۔

دیر بعد اُس نے سر اُٹھایا اور کہا۔

"دیکھ بچہ میں تو اُس دہلیز پر قدم نہیں دھروں گی اب۔ بے عزت ہو کر نکلی تھی وہاں سے۔ باقی جو تیرے دل میں ہے کر لے۔ چلو تو یہ تو نہ کہے کہ ماں نے میرا بیڑہ غرق کر دیا۔ ایک بار ملنے والی زندگی حسرتوں کی بھینٹ تو نہ چڑھے۔"

اُس نے مقدمہ حمیدہ بیگم کی عدالت میں پیش کیا تو پہلے لمحے بھونچکی سی ہو کر اُس نے اُسے دیکھا۔ دوسرے لمحے نیرنگیٔ زمانہ پر اُس کی دُکھ اور یاس میں لپٹی لمبی آہ نکلی۔ تیسرے لمحے اُس کے گود میں دھرے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے خود کو پھٹکار رہا تھا۔

اب تھوک کر اُسے چاٹنے والی بات ہی ہے نا۔ اُس وقت ٹنگا رہا میرا ساتویں آسمان پر تھا۔ یہ بھی کوئی نقص تھا۔ ہزاروں چھوڑ لاکھوں میں کھیلنے والا ہیرا سا لڑکا۔ عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔

اگلے چند لمحوں میں قطار در قطار رشتہ داروں کی جلی کٹی باتیں تھیں۔

"سوچنے کی مہلت دو" جیسے بہانے کے دنوں میں بھی بیٹی کی بڑھتی عمر، یونہی کنواری رہ جانے کا غم، ابھی تو بیٹے کنوارے ہیں جیسی جلی بھُنی سوچیں تھیں۔ آگے کیا بنے گا؟

نسیمہ نے سنتے ہی کہا تھا۔ "ہائے یہ ٹنڈا ہی مقدر میں تھا تو پہلے کیا بُرا تھا؟ دو ہاجو والی بچ تو نہیں تھی۔"

بیٹی رضامند تھی۔ پیسے کی فراوانی دیکھ بیٹھی تھی۔ یوں بھی اب شادی ہو جانی چاہیے جیسی کیفیت پر اُتری ہوئی تھی۔

اب نائلہ گاؤں میں تھی اور نسیمہ شہر میں۔ شادی کے آغاز کے چند ہفتوں کے سوا اُس کا ویک اینڈ پر گاؤں آنا، نائلہ اور ماں کے پاس رہنا معمول تھا۔ نائلہ سے شادی کے بعد اگر وہ لکھ پتی تھا تو اب کروڑ پتی بن چکا تھا۔ خدا نے اولاد سے بھی نواز

ڈالا تھا۔

مگر اب کچھ عرصے سے ماں اُس کے چہرے پر پژمردگی کی کیفیات بکھرے دیکھتی تھی۔ ایک دن جب وہ اُس کے پاس آ کر بیٹھا۔ ماں کے دل اور آنکھوں میں تیرتا سوال اُس کے ہونٹوں پر آ گیا تھا۔

اب تیرے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ تُو مجھے مسرور اور مطمئن کیوں نظر نہیں آتا؟

”ماں!“

وہ یاس گھلے لہجے میں بولا۔

”میں دو انتہاؤں میں پھنس گیا ہوں۔“

نسیمہ صفائی کے مالی خولیے میں مبتلا ہے۔ باہر کے جوتے الگ، کمروں کے الگ، باتھ روم کے الگ، کچن کے الگ، لان کے الگ، میں غلطی کر جاتا ہوں تو ڈانٹ کھاتا ہوں۔ وقت پر اُٹھنا ہے، نہیں اُٹھتے ہو تو اس کی مسلسل بول مار۔ صفائی ادھوری ہے۔ اُسے چین نہیں۔ پرنا تو اس کے کاندھوں پر دھرا رہتا ہے۔

چھوٹی سی بچی ہے۔ یورین پاس ہو گیا۔ پوٹی ہو گئی۔ آدھی رات کو نل کے نیچے دھلائی شروع ہو جاتی ہے۔ دو بار نمونیے سے مرمر کر بچی ہے۔ اب لاکھ سر پٹخو۔ لاکھ سمجھاؤ۔ جواب ملتا ہے، میرے دماغ کو چڑھتی ہے بُو۔

میں تو زچ آ گیا ہوں۔ دراصل اُسے ایک نفسیاتی بیماری ہے۔ Obsession - compulsive disorder- ماہرِ نفسیات نے بھی بتایا ہے مجھے۔

ماں کو انگریزی کے ناموں والی ان پرانی بیماریوں کا کیا علم؟ اس کے لیے تو یہ بات ہی ناقابلِ برداشت اور توہین آمیز تھی کہ اُس کے اتنے کماؤ اور دریا دل بیٹے کو اس کی بیوی کسی بات پر ڈانٹے۔

”تم بھی تو زنخے ہو۔ پہلے سر پر چڑھا لیتے ہو۔ جب وہ تمہارے مونڈھوں پر چڑھ کر ناچنے لگتی ہیں تب تمہیں ہوش آتا ہے۔“

ماں کی بات پر اُس نے تھوڑا سا غصہ کھایا تھا۔

”کوئی ننھی منی دودھ پیتی بچیاں ہیں نا جو پڑھانے بیٹھوں انہیں۔“

”بچے زندگی تو گزارنی ہے۔ سمجھوتے تو کرنے پڑتے ہیں۔“

”نہیں ماں۔“ اُس کے لہجے کی سختی پر وہ چونکی تھی۔

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ آج کل میں کسی نارمل، سمجھدار اور اعتدال پسند لڑکی کی تلاش میں ہوں۔“

ماں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔ بے اختیاری سے اُسے دیکھا۔ چند لمحوں تک دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔

”تو بچے اگر وہ بھی تیرے معیار پر پوری نہ اُتری تو“۔

”تو کیا ماں۔ میرے پاس ابھی چوتھی آپشن کا چانس بھی تو ہے۔“

☆☆☆☆☆

ٹینشن

موسم بڑا ہی دلفریب تھا ثانیہ باہر برآمدے میں بیٹھی تھی... ملازمہ چائے بنا کر لے آئی تھی... ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی... باغ کے پودے اور درخت جھوم رہے تھے۔

بیگم صاحبہ ریشماں نے دھیرے سے کہا۔

"کہو"

وہ کل والی لڑکی پھر آئی ہے حالانکہ آپ نے اس کو جواب دے دیا تھا۔

ثانیہ نے ریشماں کو کہا۔

اچھا اس کو لے کر آؤ۔

ریشماں نوری کو لے آئی۔

ثانیہ نے اس کی جانب دیکھا اور کہا۔

میں نے کل جواب دے دیا تھا پھر بھی آ گئی ہو۔

بیگم صاحبہ... وہ خزاں زدہ پھول کی مانند پژمردہ نظر آ رہی تھی... غیر شعوری طور پر اس کے پاؤں کانپ رہے تھے... میں بڑی امید لے کر آئی ہوں دو دن سے گھر میں چولہا نہیں جلا... میرا خاوند دیہاڑی پر مزدوری کرتا ہے... مگر اس کو مزدوری نہیں ملی تھی... بھوک سے ہم دونوں نڈھال تھے اور ایک مزار پر جا کر فریاد کی تو لنگر کے کھانے تقسیم ہو رہے تھے... وہاں سے پیٹ بھر کر کھایا اور کچھ کھانا ساتھ بھی لے آئے۔

نوری جوان اور اچھے نین نقش کی لڑکی تھی۔ سرخ رنگت جو زردی مائل اداسی سے دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں سے افسردگی چھلک رہی تھی۔

دیکھو... نوری... ثانیہ نے اس کی جانب دیکھ کر کہا... صفائی اور جھاڑ پونچھ کے لیے ملازمہ چاہیے... ایک لڑکی بہت اچھا کام کرتی تھی مگر اس کی شادی ہو گئی ہے اور وہ چلی گئی ہے... اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صفائی تو تم کر ہی لو گی... مگر جھاڑ پونچھ کا مسئلہ ہے... میرے ڈرائنگ روم میں بہت ہی قیمتی نوادرات رکھے ہیں جو باہر کے ملکوں سے میں خرید کر لائی ہوں... بلڈ پریشر کی مریضہ ہوں... اگر کوئی بھی چیز کا نقصان ہو جائے تو ٹینشن سے مجھے B.P ہو جاتا ہے... ایک

بلقیس ریاض

شرط پر میں نوکری دے سکتی ہوں۔
نوری کا چہرہ ایک دم سے کھل اٹھا... اس کے سرخ گال گلاب کی مانند سرخ ہو گئے۔
ایک دم سے بولی۔
بس نوکری دے دیں... ہر شرط منظور ہے۔
"پکی بات"
"جی بالکل"
وہ چائے کا آخری گھونٹ گلے سے اتار کر اس کو ڈرائنگ روم میں لے گئی... اور سائیڈ ٹیبل پر رکھی سجاوٹ کی چیزیں اور شیشے کے ریکوں میں خوبصورت دیدہ زیب نوادرات رکھے تھے... ثانیہ ان کو دکھاتے ہوئے گویا ہوئی ان میں سے ایک بھی چیز ٹوٹی تو میں تنخواہ سے روپے کاٹ لوں گی۔
نوری کا چہرہ جہاں کھلا ہوا تھا یکدم سے پژمردہ ہو گیا... وہ پیلی زرد ہو گئی۔
بیگم صاحبہ میں سارے گھر کی صفائی... یہاں تک کے کپڑے بھی دھولوں گی... مگر یہ کام آپ کسی اور سے کروالیں۔
"کیوں... تم احتیاط سے کام نہیں لے سکوگی"۔
جی... احتیاط تو بہت کروں گی... مگر۔ "مگر کیا"
"بندہ بشر ہوں جی... کچھ بھی ہو سکتا ہے"۔
تم ابھی سے بدشگونی۔ کی باتیں کرتی ہو... یہ کیوں نہیں کہتی کہ ان شاء اللہ نہیں ٹوٹے گی۔
وہ سر جھکائے چہرے سے ثانیہ سے پوچھنے لگی... تنخواہ کیا ہو گی۔
"یہی بیس یا پچیس ہزار"۔
"اور بیگم صاحب ان چیزوں کی کیا قیمت ہو گی"۔
ارے پگلی ہر چیز لاکھ سے اوپر ہے... وہ جھٹ سے کہنے لگی۔
اگر خدانخواستہ کوئی چیز ٹوٹ جائے تو... سال بھر کی تنخواہ آپ کاٹ لیں گی... تو ہم کھائیں گے کیا... پیٹ کا ایندھن بھرنے کے لیے نوکری کر رہی ہوں۔
آخر تمہارا خاوند بھی تو کمائے گا۔
"لیکن ابھی تو وہ فارغ ہے... اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے وہ دھیرے سے گویا ہوئی"۔
"آپ میرے شوہر کو بھی ملازم رکھ لیں"
میں وعدہ نہیں کرتی کیونکہ ایک گھر کے دو افراد کو ملازمت نہیں دے سکتی۔
نوری... کی آنکھوں سے آنسو گالوں پر پھسلنے لگے... تو ثانیہ نے کہا۔
باورچی کو کہہ کر آج کا کھانا میں دے دیتی ہوں... کل صبح سے کام پر آجاؤ۔
نوری نے اپنے آنسو دوپٹے کے پلو سے صاف کیے... اور وہ دوسرے دن ثانیہ کے گھر کی صفائی ستھرائی کرنے لگی۔ اس کے ہاتھ میں اتنا سلیقہ تھا کہ جو کام کرتی... تو چار چاند لگ جاتے۔
وہ ایک ماہ سے ثانیہ کے گھر کی صفائی کر رہی تھی... کپڑوں کی دھلائی کے علاوہ وہ استری

بھی کر کے الماریوں میں لگا دیتی۔ ثانیہ کو اس کی عادت ہو گئی تھی۔ اس نے اس کی تنخواہ بیس ہزار سے پچیس ہزار کر دی...اور اس کے شوہر رحمت کو بھی کبھی نہ کبھی دہاڑی پر جاتا تو مزدوری مل جاتی...پھر ایک دن ثانیہ سے کہنے لگی۔

روٹیوں کے ٹکڑے جو بچ جاتے ہیں اگر اجازت دیں تو میں گھر لے جایا کروں۔

''ان ٹکڑوں کا کیا کرو گی''.

صبح چائے کے ساتھ ہم دونوں گھی لگا کر کھائیں گے۔

اچھا لے جایا کرو...اگر سالن بھی پرانا بچ جائے تو وہ بھی لے کر جا سکتی ہو۔

کام کرتے کرتے اسے دو مہینے ہو گئے تھے...ثانیہ کی سہیلیاں لنچ پر آ رہی تھیں... اور وہ نوری کے ساتھ ڈرائنگ روم کی صفائی کا معائنہ کر رہی تھی...اور یکدم سے ثانیہ نے کہا۔

یہ جو واز ہیں یہ میں پیرس سے لائی تھی بہت مہنگے ہیں...دل کو دھڑکا لگا رہتا ہے کہ ٹوٹ نہ جائیں...ہر وقت ٹینشن رہتی ہے۔

ابھی ثانیہ نے اتنا ہی کہا تھا...باہر بادل زور سے کڑکے اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔

نوری نے دکھ بھرے لہجے سے کہا۔

ثانیہ بی بی...آپ کو ان کی ٹینشن ہے اور مجھے اپنی جھگی کی ٹینشن ہے...زور کا جب مینہ برستا ہے تو پورا دن جھگی میں سے پانی نکالنا پڑتا ہے...اور جھگی کی چھت کو پھر سے مٹی سے لیپ کر کے مرمت کرنی پڑتی ہے...پھر رحمت کو اس دن دہاڑی پر مزدوری نہیں ملتی...ماشاءاللہ بیگم صاحبہ آپ کو اللہ نے نوازا ہے...ہم لوگوں کی طرح زندگی نہیں ہے...ہم ایسی چیزوں کی تمنا ہی نہیں کرتے بس روٹی کے لالے پڑے ہوتے ہیں۔ والدین نے بہت منع کیا تھا کہ رحمت سے شادی نہ کرو...مگر مجھے اس سے محبت تھی...میں رحمت سے محبت کرتی ہوں اس کو بھوکا نہیں دیکھ سکتی بہت بڑا رسک لے کر ملازمت کی ہے.

اپنے فلسفے نہ جھاڑو اور صفائی احتیاط سے کرو...یہ نہ ہو کوئی چیز ٹوٹے تو B.P شوٹ کر جائے...ان چیزوں کی خریداری کے بعد ہر وقت ٹینشن میں ہوتی ہوں...اور ہاں میرے کمرے کی الماری میں بہت مہنگی شالیں رکھی ہیں...ان کی احتیاط کرنی ہے...فنائل کی گولیاں ڈالنی ہیں...کا ہے بگا ہے ان کو نکال کر دیکھنا ہے کوئی سوراخ تو نہیں پڑ گیا...فوراً مجھے آگاہ کرنا۔

''جی بہتر...بیگم صاحب ایک بات کہوں برا تو مانیں گی''۔

''کہو''

''آپ سلامتی کی دعا مانگا کریں اپنی اور صاحب کی...ان مادی چیزوں کی فکر نہ کیا کریں''۔

یہ اللہ کی دین ہے... وہی رکھوالا ہوتا ہے... ٹینشن لینے کے بجائے ہر چیز اللہ پر چھوڑ دیا کریں۔

ثانیہ دل ہی دل میں کہنے لگی.. ''ان غریبوں کی بھی عجیب سائیکی ہے''..اور وہ نوری کی باتوں کا جواب نہ دے سکی اور کمرے کی کھڑکیاں نوری کے ساتھ بند کرنے لگی تاکہ بارش کا پانی اندر آ کر چیزوں کو خراب نہ کر سکے۔

نوری کو کام کرتے ہوئے چھ ماہ خیر و عافیت سے گزر گئے۔ ایک روز آئی ہی تھی کہ ثانیہ ڈبے سے قیمتی ڈیکوریشن کی چیزیں نکال کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے نوری کو دیکھ کر کہنے لگی۔

یہ میں پچھلے سال لندن سے خرید کر لائی تھی...سوچ رہی تھی کہ کہاں سجاؤں...نوری نے ڈرتے ہوئے کہا۔

یہ شوکیس میں لگا دیتے ہیں...قیمتی چیزیں ہیں...ثانیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بہت سمجھدار ہو گئی ہو۔ آخر سارا کام تم بخوبی کر لیتی ہو۔ اب یقین ہو گیا ہے...تم ہر چیز کی حفاظت کرو گی۔

''یہ اللہ کا مال ہے ثانیہ بیگم جی... وہی حفاظت میں رکھے گا''۔

نوری نے اپنی بات پھر دہرائی...تو اللہ کے نام سے ثانیہ کہنے لگی۔

''دیکھو نوری کبھی کبھی میرا دل بہت دہل جاتا ہے... جب تم بھرپور وعدہ نہیں کرتی''... نوری پھر بولی۔

اللہ کی حفاظت میں یہ چیزیں رہیں تو اس سے بڑھ کر کون حفاظت کرے گا۔

کچھ عرصہ اور بیت گیا تو ثانیہ کسی لنچ پر گئی ہوئی تھی نوری صفائی کر رہی تھی...سائیڈ ٹیبل کے قریب سے گزری تو یکدم وہ میز پر پڑے ہوئے خوبصورت پھولدانوں سے ٹکرائی اور ایک پھولدان ایک چھناکے سے گرا اور ٹوٹ گیا...نوری کو ایسا لگا جیسے اس کا دل اچھل کر باہر نکل آیا ہو... آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا...اسی حالت میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے وہ پھول دان کی کرچیاں دیکھتی رہی...پھر ہمت پیدا کر کے اس نے کمال صفائی سے ڈرتے ہوئے پھول دان کی کرچیاں اکٹھی کیں اور پلاسٹک کے بیگ میں ڈال کر باہر ڈسٹ بن میں ڈال دیں...نوری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے...وہ اس قدر پریشان تھی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اس نے جلدی سے اپنا موبائل فون اٹھایا اور رحمت کو کہا کہ فوراً جھگی پر پہنچو...اور ایک پوتھین کے بیگ میں شاطوس کی شال اور پشمینہ کی شال میں بہت ہی قیمتی نوادرات کو ان میں لپیٹا اور گھر سے باہر جب نکلی تو چوکیدار کھانا کھا رہا تھا...وہ دور سے بولا۔

کہاں جارہی ہو؟
''جی میں بیگم صاحب کی شالیں رفو کرنے کیلئے مارکیٹ جارہی ہوں انھوں نے کہا تھا کہ جن کو سوراخ پڑا ہے تم صبح لے جانا''۔
اچھا... اچھا جاؤ... جاتے وقت گیٹ بند کر جانا۔
وہ دور سے بولی۔
اچھا بھیا۔
اور وہ گیٹ سے باہر نکل گئی... تیز تیز قدم رکھتے ہوئے وہ جھگی تک پہنچی۔ رحمت کو دھڑکتے دل کے ساتھ سارا واقعہ بتایا... جتنا سامان ہو سکا... وہ انھوں نے باندھا... نوری کے دل کی دھڑکن اتنی تیز تھی کہ... یوں لگنے لگا... کہ اس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ ایک گھنٹہ سامان باندھنے میں لگا۔ دونوں چپکے سے جھگی سے نکلے اور ریلوے اسٹیشن پہنچ کر خانیوال کی ٹکٹ لی اور وہاں اس کے والدین کا گھر تھا۔
دونوں ٹرین میں ایسے بیٹھے تھے جیسے... ابھی واردات کر کے آئے ہیں اور... کوئی آکر ان کی چوری پکڑ لے گا اور وہ سلاخوں کے اندر بند ہو جائیں گے۔
خانیوال پہنچ کر... والدین ان کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ یہ اچانک کیسے آگئے... نوری نے ڈر کے مارے کسی کو کچھ نہ کہا... یہاں تک کے بھائیوں کے ڈر سے ماں کو بھی کچھ نہ کہہ سکی۔
نوری میٹرک پاس تھی۔ آگے تعلیم حاصل نہیں کر سکی تھی تو رحمت سے اس کی شادی ہو گئی تھی۔
کچھ دن کے بعد رحمت کسی گاؤں گیا تھا نوری نے ایک خط دیا اور کہا۔
یہ تم پوسٹ کر دو۔
خانیوال میں کیوں نہیں پوسٹ کیا۔
یہاں خطرہ تھا وہ ڈھونڈ لیتے... تم وہاں پوسٹ کر دو۔
ثانیہ کو ایک ہفتے کے بعد ایک خط ملا۔
جس میں لکھا تھا۔
ثانیہ بی بی جب میں ملازمت کرنے آئی تھی تو میرا ارادہ چوری کرنے کا نہیں تھا... لیکن اچانک دو لاکھ کا پھول دان گرا تو میں اس قدر پریشان ہوئی کہ کئی سال ملازمت کرتی رہتی تو رقم ادا نہیں کر سکتی تھی... ویسے بھی ان چیزوں کی آپ کو بہت ٹینشن تھی۔ میں نے آپ کی ٹینشن دور کرنے کے لیے کچھ چیزیں بھی لے آئی ہوں... برائے مہربانی غریب لڑکیوں کو ملازمت ضرور دیں مگر یہ شرط نہ رکھیں کہ قیمتی چیز ٹوٹے تو آپ روپے کاٹ لیں گی کیونکہ غریب کی اتنی پہنچ نہیں ہوتی... آپ کو اللہ نے نوازا ہے۔ اس پر بھروسہ رکھا کریں... اللہ ہی نایاب چیزیں دیتا ہے اور اللہ ہی واپس لے لیتا ہے۔ معافی کی طلبگار نوری۔

☆☆☆☆☆

محبت سانس لینے دو

''کبھی کبھی میرا اس محبت سے دم گھٹنے لگتا ہے''

سائیکاٹرسٹ کا آخری جملہ میرے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھا کیونکہ میں اس محبت میں شدت اختیار کرتا جا رہا تھا مجھے احساس ہی نہ رہا کہ انسان خود سے بھی تو محبت کرتا ہے میں جس محبت کو دوسرے لیے آکسیجن سمجھ رہا ہوں وہ اس کے لیے کاربن مونو آکسائیڈ بھی تو ہو سکتی ہے اور اب جو باتیں سامنے آ رہی تھیں ان سے یہ سب ثابت بھی ہو رہا تھا۔

سائیکاٹرسٹ اس کے بعد شاید اپنے اختتامی جملے بولی اور اٹھ کر چلی گئی لیکن میں جیسے سکتے میں آ گیا اور اس کا وہ جملہ میرے سر پر ہتھوڑے کی طرح برسنے لگا۔

''کبھی کبھی میرا اس محبت سے دم گھٹنے لگتا ہے'' اور میں اپنی سوچوں میں چھ ماہ پیچھے چلا گیا۔

احمد نے کال کی کہ میں تمہیں لینے آ رہا ہوں شہر سے باہر تھوڑا کام ہے تو ساتھ چلتے ہیں میں تیار ہو گیا۔ احمد میرا بہت اچھا دوست ہے مجھے اس کی ناکام ازدواجی زندگی کا افسوس رہتا ہے کیونکہ اسکی بیوی بچوں کو لیکر جا چکی تھی اور مکمل طور پر علیحدگی کا فیصلہ بھی کر چکی تھی بلکہ جب وہ ہمارے بارے بات کرتا ہے تو مجھے اور بھی عجیب سا احساس ہوتا ہے کہ کاش احمد بھی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوتا وہ اکثر یہی کہتا تم لوگوں کی ذہنی ہم آہنگی بہت ہے۔ تم لوگ ایک دوسرے کو سمجھتے ہو۔ میں اسے یہی سمجھاتا کہ اس رشتے کو نبھانے کے لیے ہمیں بہت سی باتوں کو نظرانداز کرنا پڑتا ہے ایک دوسرے کو برداشت کرنا پڑتا ہے اور یہ یکطرفہ کوشش پر مبنی نہیں ہوتا۔

گاڑی چلاتے ہی اس نے پوچھا کہ اب بھابی کی طبیعت کیسی ہے۔ قریب ایک سال سے عاتکہ بیمار تھی اور بیماری کچھ خاص سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ بظاہر اسے سانس کا مسئلہ تھا ٹیسٹ کروانے پر معلوم ہوا کہ تھائیرائیڈ ہے۔ لیکن یہ معاملہ کہیں کہیں نفسیاتی بھی معلوم ہوتا تھا۔ احمد کے بقول تمہیں کہیں گھومنے کے لیے جانا چاہیے کچھ وقت اکیلے شمالی علاقہ جات گزار کر آؤ اپنی روزمرہ کی مصروفیات میں کچھ وقفہ دو بھابی کو وقت دو۔ میں اس بات پر حیران تھا کہ مجھ سے زیادہ کون اپنے بچوں کو وقت دیتا ہوگا ایک شخص جو اپنی بینک کی اتنی مصروف نوکری کے باوجود اپنے بچوں کو تقریباً روزانہ کی بنیاد پر باہر لے کر جاتا ہے ان کے ساتھ وقت گزارتا ہے سارا دن کی تھکاوٹ کے

قمر بشیر

باوجود وہ اپنی اس روز کی ڈیوٹی کو نبھاتا ہے اور اس کے بچوں کو کیا چاہیے۔
"میں نے بچوں کی نہیں بھابی کی بات کی ہے۔ انہیں اکیلے وقت دو ان کے ساتھ بیٹھو بات کرو صرف ان کے ساتھ گھومنے کے لیے جاؤ تاکہ تم کھل کر ایک دوسرے سے وہ باتیں کر سکو جو بچوں کی وجہ سے زبان پر نہیں آتیں" احمد نے سمجھاتے ہوئے کہا۔
میں اس بات پر بہت ہنسا اس کی بات کافی حد تک درست تھی لیکن یہ ہمارے معاملے میں بالکل بھی درست نہیں تھی۔ عام طور پر والدین اپنے بچوں کو نانی یا دادی کے پاس چھوڑ جاتے ہیں ہم ایسا بہت ہی کم کرتے تھے ہمارا بچوں سے کچھ زیادہ ہی لگاؤ بھی تھا اور اس معاملے میں ہم لوگ بہت زیادہ فکرمند بھی ہوتے ہمارا ماننا ہے کہ اپنے بچوں کا آپ کے علاوہ کوئی بھی دوسرا رشتہ اتنے اچھے سے خیال نہیں رکھ سکتا۔ ہمیں عجیب سے واہمے ہوتے ہیں بلکہ مجھ سے زیادہ عاتکہ اس معاملے میں محتاط ہے۔ وہ کبھی بھی ہم دونوں کے اکیلے کسی تفریحی مقام پر جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ وہ کبھی بھی نہیں مانے گی کہ بچوں کے بغیر ہم کہیں سیر کے لیے جائیں۔
"اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہم دوسرے کے خیالات خود ہی فرض کر لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے تمہارے مفروضات بالکل درست ہوں۔ لیکن ایسے رشتوں میں بھرم اور شرم کی وجہ سے بہت سی باتیں ان کہی رہ جاتی ہیں۔" احمد نے فلسفہ جھاڑتے ہوئے کہا۔ لیکن دوبارہ میں اس کی بات سے کافی حد تک متفق تھا مگر میں اسے اپنے حالات کے ساتھ کسی بھی طرح سے جوڑ نہیں دیکھ رہا تھا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ میں نے اپنی بیگم کو بھی بچوں کی طرح پیار دیا تھا اس کا ایسے خیال رکھا جیسے ہر لڑکی چاہتی ہے۔ ہر لڑکی کا ہیرو اس کا باپ ہوتا ہے۔ کارل ینگ نے اس نظریے کو الیکٹرا کمپلیکس کا نام دیا ہے جسے سگمنڈ فرائیڈ کے ایڈی پس کمپلیکس کا فی میل ورژن بھی کہا جاتا ہے۔ باپ چاہے جیسا بھی ہو معاشرے کی نظر کتنا ہی برا کیوں نہ ہو وہ اپنی بیٹی کے لیے ایک آدرش کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ باپ سے اسے غیر مشروط محبت ملتی ہے جو اسے احساس دلاتی رہتی ہے کہ دنیا میں ایک ہی شخص ہے جو اس کی فکر کرتا ہے اس کا خیال رکھتا ہے اس کی تمام تر خواہشات کو پورا کرنے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔ اور باپ کے بعد یہی کچھ وہ اپنے شوہر میں دیکھنا چاہتی ہے۔ اسے اگر کسی سے پیار ہوتا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اسے ان تمام باتوں کی جھلک نظر آتی ہے یا اگر وہ کسی کو جیون ساتھی بھی چنتی ہے تو اس شخص سے وہی توقع رکھتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب اس کی توقعات ٹوٹتی ہیں تو وہ اندر سے بکھر جاتی ہے اور بیشتر لڑکیاں سمجھوتے کے نام پر تمام عمر گھٹ گھٹ کر گزار دیتی ہیں۔
اور اب اگر میں ان باتوں کے حوالے سے اپنے معاملے کو دیکھوں تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ عاتکہ کی توقعات ہرگز نہیں ٹوٹی ہوں گی۔ کیونکہ میں نے اپنی دس سالہ ازدواجی زندگی میں

اپنی ہر ممکن کوشش کر کے اسے خوشی ہی دی ہے۔ میں نے خود کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے جو کچھ جیسا چاہا میں نے اسے اسی طرح کر کے دیا۔ اور احمد خود بھی ان سب باتوں کا گواہ تھا کہ یہ سب صرف باتیں نہیں تھیں میں نے یہ کر کے بھی دکھایا تھا اس کے بعد جو احمد نے کہا مجھے اس نے سوچنے پر مجبور کر دیا۔

”پھر مجھے لگتا ہے تم محبت کی اوورڈوز دے چکے ہو۔“

دو ماہ قبل میں عاتکہ کو سائیکاٹرسٹ کے پاس لے گیا اور آج اسے جدا ہوئے ایک ماہ گزر گیا ہے۔ ایک ماہ سے میں جاگنگ کے لیے نہیں گیا تھا آج جب ایک راؤنڈ لگا کر بیٹھا تو وہی سائیکاٹرسٹ میرے پاس آگئیں پہچانا اور سلام دعا کے بعد عاتکہ کا پوچھنے لگیں کہ وہ دوبارہ کیوں نہیں آئیں۔ میرے بتانے پر انہوں نے کافی افسوس کا اظہار کیا اور پھر وہ سب باتیں بتائیں جو عاتکہ مجھے نہ بتا سکی۔

”مجھے ایسی کوئی شکایت نہیں ہے ان سے۔ میں بس خود کو نہیں کھونا چاہتی جو کہ میں کھو چکی ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس گھر میں صرف ایک ہی شخصیت رہتی ہے ہر بات میں وہی ہے۔ ایسا کہاں ہوتا ہے۔ مجھے خود بھی تو اپنے لیے وقت چاہیے۔ میں ہر بات کے لیے ان کی محتاج بن کر رہ گئی ہوں۔ وہ قریب دکان تک جائیں تو میں خود کو ادھورا سمجھتی ہوں مجھے خوف آنے لگتا ہے دیواریں کھانے کو دوڑتی ہیں۔ میرا دل کرتا ہے یہ شخص اسی گھر میں موجود رہے بس کہیں بھی نہ جائے۔ مجھے یہ سب کیوں محسوس ہوتا ہے۔ مجھے بالکل ناکارہ کر کے رکھ دیا ہے۔ میں خود کہیں موجود ہی نہیں ہوں۔ مجھے اب خوف آنے لگا ہے انہیں کچھ ہو گیا تو کیا کروں گی۔ میں اس خوف سے کیسے نکلوں۔ میرے دماغ میں چیخوں کی آوازیں گونجتی ہیں۔ میں خود کو ڈھونڈنا چاہتی ہوں میں ان کے اس حصار سے نکلنا چاہتی ہوں جس میں میری روح کو باندی بنا رکھا ہوا ہے اور انہوں نے کوئی زبردستی نہیں کیا یہ میں خود ہی اس حصار میں چلی گئی ہوں۔ پتہ نہیں اس میں کس کا قصور ہے۔ مجھے اس کا ایک ہی حل نظر آتا ہے کہ میں ان سے پہلے اس دنیا سے چلی جاؤں ورنہ میں انکے بعد والی اذیت برداشت نہیں کر سکوں گی میں وہ سوچ سوچ کر ہی مرتی جا رہی ہوں۔“

سائیکاٹرسٹ نے بتایا کہ ان کی یہ حالت اسی وجہ سے ہوئی تھی کہ مجھ پر وہ بہت زیادہ انحصار کرنے لگ گئی تھی۔ جسے وہ 'Personality Disorder Dependent' کا نام دے رہی تھی۔ اس میں انسان کو ایسے شخص کے کھو دینے کا بھی ڈر رہتا ہے جو اس کا بہت زیادہ خیال رکھتا ہو۔ چونکہ عاتکہ نے خود بھی نفسیات پڑھ رکھی تھی تو وہ اس سے نکلنا چاہ رہی تھی اور ان سب کو کچھ زیادہ ہی سوچ رہی تھی جس کی وجہ سے اس کا ڈپریشن بڑھتا جا رہا تھا۔

سائیکاٹرسٹ اپنے تعزیتی کلمات کہہ کر چلی گئیں لیکن میں وہیں بیٹھا بھی سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی محبت کی اوورڈوز سے دم گھٹنے لگتا ہے

☆☆☆☆☆

سوالیہ نشان

سبز آنکھوں والا دراز قامت خوبرو توصیف جہانگیر لڑکے لڑکیوں کے گروہ میں نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سراپا جمال تھا اور جمال پرست تھا اُس کی نظروں کا تخاطب ہمیشہ کوئی زرنگار مورت کوئی اُجلا چہرہ ہوتا عام چہروں، عام لوگوں کو اس کا غرور کسی شمار میں نہ رکھتا تھا۔

گندمی رنگت، مناسب نین نقش والی سماویہ خان ذہانت میں سارے بیچ پہ سبقت لیتی تھی، ہر امتحان میں ٹاپ پہ گنداں نام پر تیسرے مہینے وظائف کا چیک وصول کرنے والی سماویہ، رشک بھری مبارکیں وصول کرنا جس کا معمول تھا، اُس کے دل میں کس چور لمحے نے ایسی عقب لگائی کہ سبز آنکھوں والا اُس کی ذہانت کے دلائل اعتراضات کو ردّ کرتا دل میں جا اُترا۔ یہ بھی جانتے ہوئے کہ یہ بندہ سادہ کپ، میلی گُرسی، پرانا لباس اور عام وجود سے دور بھاگتا تھا۔ وہ اسے سمجھانا چاہتی تھی حُسن ایک بے شعور خوشنمائی ہے وہ حق اور سچ سے اُسے روشناس کرانا چاہتی تھی۔ اعلیٰ اسوہ، کردار سیرت کے اُس کے پاس ٹھوس دلائل تھے مگر وہ اُن کی مدد سے تقریری مقابلہ تو جیت سکتی تھی۔ توصیف کے سامنے وہ ایک ''درخواست'' ''کمزور التجا'' جیسے لگتے تھے اس لیے وہ اُن کو کبھی زبان پر نہ لائی۔ کبھی وہ اپنی توپوں کا رُخ اپنی جانب کر لیتی۔ اَے مس ٹاپ ون! تمھیں بھی دور ٹھہرے دراز سائے کی سورج کی شعاعوں میں چمکتے سُنہرے بال، کسی پورٹریٹ جیسی شفاف بند آنکھیں، لشکارے مارتا رنگ روپ اور ناز بھری مسکراہٹ نے اپیل کیا تو اپنے منطقی دلیلوں کی گٹھڑی اپنے پاس رکھو۔ من نہ کردم شما حُذر بہ کیند...... واہ بی بی کبھی وہ خود کو سخت ڈانٹتی تو کبھی خود کے لیے جواب پیش کرتی۔ نہیں یہ الزام ہے میں نے اُسے بعد میں دیکھا پہلے سُنا۔ وہ اُس روز بول رہا تھا...... بات غالباً ٹک ٹاک...... یا...... ایف بی ریل زکی بے مقصدیت کی تھی۔ اُس کا اعتماد......اور ہاں وہ میرے

دردانہ نوشین خان

ہم خیال بول رہا تھا۔ تو کیا ہم خیال بولنے والا ہر کوئی محبوب بن جاتا ہے؟؟...... نہیں نہیں...... یہ بات نہیں ہے...... اور پھر وہ اُداس ہو جاتی۔ اور یہ تو کبھی سماویہ خان کی خودداری سے توقع ہی نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ توصیف جہانگیر کے آس پاس پھرے گی۔

پھر ایسا ہوا کہ میرال آگئی۔

میرال ...... گویا حسینہ عالم...... توصیف جہانگیر کا فِٹ جوڑ...... وہ یوسف ثانی یہ آسمانی حور......

یونیورسٹی کی دوسری منزل کی بلیک وڈ ریلنگ پہ اُس کی نقرئی تراشیدہ انگلیاں سائیڈ پوز سے آرٹ کی گئی مورتی کی طرح صراحی دار گردن، ہنسلی کی نمایاں ہڈی...... رخسار کی جاء لائن (Jow Line) تیکھی ناک، سڈ ابری ہونٹ وہ مصوری کا شاہکار پوز تھی۔ جسے کچھ فاصلے پہ ٹھہرے توصیف نے دیکھا اور دیکھتا چلا گیا اور توصیف کی اس دیکھن کو سماویہ نے دیکھا اور من کے کانچ کا کھلونا بلندی سے گرا اور پاش پاش ہو گیا۔ یہ تو اظہر من الشمس ہو گیا۔ زلزلہ ہائی ریکٹر سکیل کا تھا مگر تھمتا چلا گیا۔ تصویر ہٹ گئی تھی۔ دیکھنے والا ابھی تک منظر کر دیتا ہے حس و حرکت موجود تھا۔ تیسرا وجود مکمل منہا ہو چکا تھا۔

عجیب لڑکی نکلی میرال بھی۔ وہ جس کے حُسن جہاں تاب سے لوگ متاثر تھے وہ سماویہ خان سے متاثر نکلی۔

”تو آپ ہیں وہ سکالرشپ آن گوئنگ گرل "Scholar ship on going girl"

”کیا مطلب؟“

”آپ سے ملاقات میرے لیے اعزاز ہے“

”ارے...... شرمندہ کر رہی ہیں۔“

”وہ لکھنؤ یونیورسٹی سے آئی ہیں“ کسی تیسری نے گرہ لگائی

"No infact I was really impressed by her academic Victories"

اس پہلی ملاقات میں دونوں اپنے اپنے رشک کی گھڑولیاں سر پہ اُٹھائے دوستی کے کنوئیں کی جانب بڑھیں اور بڑھتی چلی گئیں۔

”سماویہ...... سوچو یہ 1823 year ہے۔ ایک رئیس کی صاحبزادی اور چرواہے کی جاہل بیٹی کی دوستی ہو گئی ہے۔ رئیس کی صاحبزادی نے قاہرہ، مشہد، قرطبہ اور آکسفورڈ سے کتب منگوا کر پڑھ رکھی ہیں۔ چرواہے کی بیٹی کھیل کود کی شوقین...... بتاؤ رشک کس پہ کرنا چاہیے“

”اے چرواہے کی چنچل جاہل بیٹی! یہ فیصلہ کسی شاعر فنکار سے کروالو...... کسی مصور کسی عاشق نامراد سے کروالو...... ذہین صاحبزادی اتنا جانتی ہے یہ 1823 نہیں ہے۔ یہ 2023 ہے۔ ذہانت، دیانت، صداقت اپنا شباب گزار چکی ہیں اب انھیں

ضعیفی کا سامنا ہے۔ یہ مادیت، ظاہریت اور چکا چوند کی رغبت کا دور ہے۔“

”فیصلہ شاعر سے کیا کرانا وہ تو دیوانہ ہوتا ہے، فنکار کہاں کا دانش مند فرزانہ ہوتا ہے۔ مصور کو تو سب Fine دِکھتا ہے اور عاشق فریب کا بھونرا ہے۔“

اُن کی دوستی میں بھی ٹھنی رہتی تھی اور آس پاس توصیف موجود رہتا۔ وہ تو میرال کا سایہ تھا اور میرال سایوں کی عادی تھی۔

توصیف کو اپنے مُنہ زور عشق کے اظہار کے لیے الفاظ کی ضرورت تو نہ تھی اُس کی تو آنکھیں نثار جاتی ہیں تاثرات اعلان کرتے تھے، پھر بھی اس نے اظہار کر ڈالا

”حُسن اے مِس ورلڈ...... میں چار سال سے اس یونیورسٹی میں ہوں...... ان چار سالوں میں کوئی آٹھ دس لڑکیاں تو میری خاطر خودکشی کرنے والی تھیں وہ کیا کہا ہے شاعر نے ہزار چہرے ہزار آنکھیں...... میں کس کو دیکھوں میں کس کو سوچوں...... ایسا ہی ہے ناں شعر...... میرال...... Look at me ...... میں سراپا جمال ہوں او جمالیات پسند ہوں“ وہ اپنے اور پھر میرال کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”مسٹر سراپا جمال...... آپ جمالیات پسند ہیں شوق سے اپنا شوق جاری رکھیں اپنے شوق میں مجھے گھسیٹنے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔“

توصیف کے پاس بہت دلائل تھے اور آخری دلیل ”عشق“ تھی۔

میرال کے پاس ہر دلیل کا رَدّ تھا اور سب سے کمزور دلیل ”عشق“ تھی وہ کہہ رہی تھی۔

”مسٹر توصیف جہانگیر...... میری لائف میں مَیں نے کوئی چار سو تک اپنے عشق کے دعوے داروں کی گنتی کی تھی آگے گنتی چھوڑ دی...... میں سوچتی تھی یہ کیسا عشق ہے اپنے پاس مخلص، سچا چاہنے والیاں، اچھی صفات رکھنے والیاں خوش شکل شائستہ لڑکیوں کو کراس کر کے مجھ تک پہنچتا ہے...... چلو مان لیا میں خوبصورت ہوں...... تو...... عشق کا فارمولہ خوبصورتی ہے۔ خوبصورتی ماند ہوگئی تو کسی اور خوبصورت کی جانب بڑھ گئے کیونکہ...... یہ تو طے ہے خوبصورت پھول مرجھاتا بھی ہے، خوبصورت محل، خوبصورت گاڑی پرانی ہوتی ہے اور خوبصورت عورت بھی بوڑھی ہو جاتی ہے۔“

عجیب کوئی بدماغ لڑکی تھی۔ جسے اپنی تعریف سے چڑ ہوتی تھی۔ اُس کا جنون اعلیٰ مقاصد، یونیک پروجیکٹ، محنت، کر گزرنے کی لگن تھا۔ اوپر والے نے اُسے حُسن کی مورتی بنا دیا تھا پوجا کروانے والی کوئی خصلت اُس میں نہ تھی۔

میرال ساویہ کی محنت و ذہانت کو اپنے لیے مقابلہ سمجھ سکتی تھی۔ توصیف کو جیتنا اُس کے لیے کوئی گول نہ تھا اور جس کی دھاک تلے دبی تھی وہ توصیف جہانگیر کی چاہت میں گرفتار تھی، مگر وہ دوست ہونے کے باوجود

یہ بھی میرال کو نہیں بتا سکتی تھی کیونکہ وہ شاہین کے مقام سے پر کٹے کوے کے مقام پر نہیں آ سکتی تھی وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ توصیف کی وجاہت پر نہیں مرمٹی...... پھر کس چیز پر مرمٹی؟ اُس متکبر، مغرور، تک چڑھے بزعم خود شہزادے میں مرمٹنے کے لیے اور تھا کیا آخری ایک سال تھا اور یہ بے سُری تکون تھی۔ اوپر سے سالانہ تقریبات کی بڑی شہرت والے ڈرامے میں توصیف نے شہزادہ سلیم کا کردار کیا کرلیا اُس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ سوشل میڈیا پہ وائرل ہو گیا۔ دو ٹی وی چینل نے اُسے ڈرامہ آفر دے دی۔

توصیف اپنے ساتھ میرال کو کردار کرنے کی پیشکش کر رہا تھا اور محبت کے موضوع پر اُن کی آخری ملاقات تھی۔

''یار میری بات سنو...... پرانی جینز اور چھیکے کرتے سے جان چھڑا کر بہتر بن کر سامنے آؤ میں تمھیں ٹاپ کلاس پروڈکشن ہاؤسز کے کام دلاتا ہوں تم اس فیلڈ میں تھوڑی سی محنت کر کے اس وقت کی ساری سیلبریٹیز کو چاروں شانے چت کر سکتی ہو...... اپنی ویلیو جانو...... کبھی خود کو آئینے میں وقت دے کے دیکھو۔''

''اچھا یہ بتاؤ میرا کیا اچھا لگتا ہے تمھیں؟'' پہلی بار لہجہ نرم تھا۔

''یہ جھیل سی آنکھیں...... Face پہ جگمگاتی صبح کی کرنیں۔ اتنے اتنے گھنے گھنا بال...... بلکہ زلفیں۔ یہ لب یہ رخسار یہ قد یہ قامت یہ قیامت کی اُٹھان۔''

''بس...... حسن پرست شاعروں نے صدیوں سے عاشقوں کی مت مار رکھی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ میری آنکھیں دُھندلا جائیں، رنگت ماند پڑ جائے، زلفیں چھدری چار لٹیں بن جائیں اور...... لب و رخسار بہار کھو دیں تو؟''

''تو کیا؟''

''تو پتا ہے کیا ہے جو نہیں بدلے گا، جس پہ زوال نہیں آئے گا''

وہ خاموش رہا تو کہا

''تمھیں نہیں پتا...... میں بتاتی ہوں۔ میرا انداز فکر، میری سوچ، میری مثبت Qualities...... یعنی کہ میں، اگر میری ''میں'' سے تمھیں عشق ہے تو پھر تو یہ عشق ہے ورنہ...... گلی چھاپ دل پشوری۔''

''کیوں بہاریں کھو دیں وغیرہ...... وہ اُس کی لاجک سے چڑ گیا "No" وہ بھنا گیا ''فضول کے وہم ہیں۔'' اُس کی سمجھ نہیں آتی تھی میرال کہنا کیا چاہتی ہے کیوں بے بنیاد گمان پہ اُسے کھونا چاہتی ہے۔ پھر وہ ہوائی وعدے کرنے لگا ہر زمانے، ہر زوال میں دل میں رکھنے کے وعدے چاند تارے توڑ لانے جیسے وعدے...... وہ خاموش ہو گئی، خاموشی سے اُٹھ گئی۔ ساویہ نے یہ سب سُنا تو سوچا واقعی خدا جب حُسن دیتا ہے ''حُسن خیال'' آہی جاتا ہے یہ بھی سوچا میرال نے اُسے ٹھکرا دیا اُس (توصیف) کا دل ٹوٹا ہو

گا۔ میرا بھی تو دل ٹوٹا تھا۔ اب میرال کے دل ٹوٹنے کی باری ہے۔
ایک سال ہی تو تھا گزر گیا، ایک شجر کے پنچھی بکھر گئے۔
کچھ عرصے بعد ساویہ خان کو ملٹی نیشنل کمپنی میں پرکشش جاب مل گئی اُس کی C.V ہی اتنی شاندار تھی، پھر اُس کے ماموں کی شاندار سفارش تھی اُسی ماموں کی وہ بہو بن گئی۔
توصیف جہانگیر نے ٹی وی پلے کیے مگر اداکاری میں جم نہ پایا اُسے کمرشل ایڈز میں پک کر لیا گیا پھر سنا ہے وہ امریکہ چلا گیا۔
حُسن کی دیوی کی کچھ خبر نہ ملی۔ ویسے سب کو لگتا تھا وہ کفرانِ نعمت کر رہی ہے واضح راستے کو ترک کر کے غیر واضح پر چل رہی ہے۔ آرام سے کسی بڑے آدمی سے شادی کر کے راج کرتی۔
گیارہ سال بعد:
کوئی ماڈرن سی عورت پارک کے بنچ پہ سٹک پر ہاتھ رکھے سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ اُس کے بوائے کٹ سیاہ و سفید بال تھے۔ اوورکوٹ میں جسامت کا اندازہ نہ ہوتا تھا۔ سرما کی شام جوں جوں ڈھلنے لگی کرکٹ کھیلنے والے لڑکے اور والدین کے ساتھ آئے ہوئے بچے ایک ایک کر کے نکلنے لگے۔ پارک کی لائٹس روشن ہونے لگیں۔ سردی بڑھنے لگی سر پر ٹوپا اور جرسی جینز میں کوئی عورت دو بچوں کے ہاتھ تھامے بیرونی گیٹ کی طرف نکلنے کے لیے بڑھ رہی تھی۔
بچے کے ہاتھ سے موبائل چھوٹا اور سٹک والی ماڈرن عورت کے پاؤں کے پاس گھاس پر جا گرا اُس نے سر اُٹھا کر بچے کو سائل دی۔ بچے نے سوری کہہ کر موبائل اُٹھایا، تو اُس کی ماں یکدم چونکی۔
”میرال؟...... میرال ہو تم؟“
بیٹھی ہوئی عورت نے پلکیں جھپک کر پہچاننے کی کوشش کی۔
”آئی تھنک...... تم وہ ٹاپر لڑکی؟ کیا تھی؟“
”ساویہ خان“ پھر دونوں نے فرطِ مسرت سے پُر جوش معانقہ کیا۔
”میرال کہاں چلی گئی تھی تم؟“ ”تمھاری کوئی خبر ہی نہ ملی“
”پہلے اپنی سناؤ...... شادی تو ہو گئی نظر آ رہا ہے۔“
”اب کیا چھتیس سال کی عمر تک شادی نہ ہوتی...... ان کے پاپا کالج میں پڑھاتے ہیں، میں ملٹی نیشنل کمپنی میں ڈائریکٹر ہوں۔“
پھر دونوں نے تفصیلی احوال کے لیے کل اسی جگہ ملاقات طے کی۔
اگلی شام میرال پارک کے باہر گاڑی میں بیٹھی انتظار کر رہی تھی ساویہ کو لے کر ایک اچھے سے ریستوران گئی۔ کافی کے کپ کو اُٹھاتے ہوئے میرال نے کہا۔
”جی تو کیسی ہو؟“
”بچے پاپا کے ساتھ ہیں۔ اب سکون سے

اپنی سناؤ، شادی کی؟؟"

"تم جانتی ہو میں ایڈونچرس تھی۔ سیدھی لکیر جیسی زندگی میں میرا دل نہیں لگتا تھا مگر تم شاید نہیں جانتی کہ بچپن سے مجھے سکیٹنگ کا شوق تھا۔ مجھے بلندیوں پہ چڑھنے اور پہاڑوں کی چڑھائی پسند تھی۔ پھر میں نے الپائن کلب آف پاکستان جوائن کرلیا۔ یہ کے ٹو چوٹی سر کرانے کی تربیت دیتے ہیں۔ میرے فادر ہائی کلاس زمیندار تھے میں اُن کی اکلوتی اولاد، وہ میری ہر فرمائش ہر ضد پوری کرتے رہے ہمیشہ۔ ماں میری سادہ سی دیہاتی خاتون تھیں اب وہ بھی نہیں رہیں۔ کے ٹو چوٹی سر کرنے والی دو پاکستانی خواتین کا بتا کر میں نے ابا کو قائل کرلیا۔ میں پُرجوش تھی۔ مقصد کی لگن تو میں ہمیشہ پیدا کرلیتی تھی مگر میرا فیملی بیک گراؤنڈ اور جغرافیائی جم پل اس شوق میں مددگار نہ تھی ہمیں تربیت میں ہی بتا دیا جاتا تھا کہ چار میں سے ایک کوشش میں زندگی کی بازی ہار جاتا ہے یہ ایک اوسط اندازہ تھا۔ کامیاب ہو جانے والے یا بچ جانے والوں کو بخ بستگی کے ریکشن مدتوں رہتے...... مگر میں تو تربیت کی چڑھائی میں جانے کیسے بُری طرح سلپ ہوئی کہ جان تو بچ گئی ایک ٹانگ ضائع ہو گئی کافی چوٹیں آئیں...... میرے ماتھے پہ بھی گھاؤ کا نشان رہ گیا ہے میری بائیں ٹانگ مصنوعی ہے سٹک کے سہارے چلتی ہوں۔"

"یہ حادثہ کب ہوا؟"

"اسے دو سال ہو گئے ہیں......"

"پھر اب...... کیا کر رہی ہو؟"

"میں نے کبھی تمہیں بتایا تھا مجھ سے لگ بھگ سینکڑوں اظہار محبت کرنے والے تھے۔ اب تو خیر وہ سب گھر بسا چکے۔ دو سال پہلے میں نے جس جس کو آزمایا اس نے میرا احوال سُن کر اجنبیت اختیار کرلی...... خیر...... کوئی مسئلہ نہیں"

"توصیف جہانگیر یاد ہے؟"

"سب یاد ہے...... وہ UAE میں ہوتا ہے پہلے امریکہ تھا۔ سوشل میڈیا نے مشکل آسان کر دی۔"

"تم سے مل کر خوش ہوا ہوگا۔ ابھی گیارہ سال ہی تو گزرے ہیں۔ تم نے اپنی Look بدل لی۔ بال چھوٹے کرالیے مگر پیاری ہو اُتنی ہی پیاری"

"پیاری دوست کو چاند میں داغ نظر نہیں آتا۔ سنیک زلو" میرال نے پلیٹ بڑھائی۔ ساویہ نے سنیک زاُٹھاتے ہوئے پوچھا

"کس طرح بات ہوئی؟"

"بات ویڈیو کال پہ ہوئی...... پتا ہے ساویہ، مجھے دیکھتے ہی اُس کے چہرے پہ تاثرات کی آندھی چل گئی۔ پہچان گیا مگر سخت حیران تھا۔ ظاہر ہے بال جو گھنا میں تھیں لٹیں ہو گئی تھیں، ماتھے پہ سٹیچ کا نشان...... وہ گلابی پن چہرے پہ جو ہوتا تھا نہ رہا، مگر خیر چھوڑو...... تلخ سا بولا" کہاں ہوتی ہیں؟

کیسی گزر رہی ہے؟'' میں نے کہا
''سرگودھا...... الحمدللہ......میں نے اُس سے شادی کا پوچھا جواب گھما گیا۔ مجھ پر سوال ڈال دیا''شادی کس شہزادے سے کی۔''
''شہزادہ تو UAE چلا گیا''
''آپ کی Achievements کا کیا ہُوا کیا چاند پر پہنچ گئیں؟'' طنز پہ طنز کر رہا تھا وہ۔
''چاند تو کہاں؟ میں تو کے ٹو کی چڑھائی میں گر گئی۔ ٹانگ ضائع ہو گئی۔''
''?Seriously'' وہ چلا اُٹھا۔ میں نے مختصر اً بتا دیا۔
''تم ہمیشہ سے سر پھری تھی۔ یہ ہونا تھا۔ لائف تباہ کر ڈالی۔''
''باقی سب چھوڑو'' میں نے کہا ''میری میموری بہت سٹرانگ ہے۔ تم نے ہر زمانے اور ہر حال میں ساتھ دینے کا دعویٰ کیا تھا نو سال پہلے (یہ ہماری بات چیت دو سال پہلے ہوئی ہے) فون کرنے کا مقصد یاد دلانا تھا۔ ایسا ہے کہ وہ دعویٰ تمھاری شخصیت سے لگا نہیں کھاتا تھا اس لیے میرے پلّو سے بندھا رہ گیا۔''
''پلّو کھول کے اُسے اُڑا دو۔ تم محبت کو ساتھ لے کر چلتی تو شاید وہ مقام آ جاتا...... میں مجنوں کے دور کا تو نہیں ہوں۔ تمھاری میموری سٹرانگ ہے تمھیں یاد ہوگا جمالیات پسندی میری مجبوری ہے۔''
''پلّو سے کھول کر اُڑا دیا......''میں ہنس پڑی

میں نے کہا ''مجھے میری سوچ پر اب پہلے سے زیادہ ناز ہے۔ سُنو توصیف جہانگیر میرے بابا کی مربعوں اراضی ہے میں اس کی تنہا وارث ہوں۔ میں نے جدید ترین ٹیکنالوجی کی مدد سے اُس کی آمدن کئی گنا بڑھا دی ہے۔ میں نے لڑکیوں کے لیے تعلیمی تربیتی ادارہ کھولا ہے۔ ''میں بہت خوش ہوں''
''اراضی تو آباد ہو گئی دل کی دُنیا آباد نہ ہوئی''اُس نے پھر ہٹ کیا
''تمھارے دل کی دُنیا آباد ہوئی؟''
''ہاں...... فیملی ہے میری ...... عشا تمھارے جتنی خوبصورت نہ سہی مگر بہت Co-operative اور ...... بہت اچھی سیرت لڑکی ہے۔''
''تو...... یوں کہو توصیف جہانگیر...... جیت تو میری ہوئی ہے'' وہ کھل کر مسکرا رہی تھی۔
کہانی کا آخری موڑ بتاتے ہوئے جہاں میرال کا چہرہ خوشی سے کھل رہا تھا وہاں سماویہ کا چہرہ درماند ہو گیا۔ جس خدشے کے تحت وہ کبھی توصیف کو حال دل نہ کہہ سکی وہ خدشہ بے بنیاد ہو گیا اور وہ ''جمال'' کی حد آخر سے نیچے سمجھوتہ نہ کرنے والا، اچھی سیرت پہ راضی ہو گیا، جو عام شے سے دور بھاگتا تھا وہ کیونکہ عام ہو گیا۔
''ہمارے ارادے کیا ہوتے ہیں؟'' دونوں بیک وقت سوالیہ نشان تھیں۔

☆☆☆☆☆

نقب زن

روشنیاں اونگھ رہی تھیں۔ سائے جاگ رہے تھے۔ فضائیں دم بخود تھیں۔ ہوائیں حبس کی زد میں تھیں۔ تمام شہر میں ہو کا عالم طاری تھا۔ وہ خوف زدہ چہروں پر تمسخرانہ نظر ڈالتے ہوئے، دندناتا ہوا اپنی منزل کی جانب محوِ پرواز تھا۔ وہ جب اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا، تو اسے ایک طمانیت کا احساس ہوا۔ گھر کو سامنے دیکھ کر تمام تھکن برف کی طرح پگھل کر بدن کے ریشوں سے نیچے گرنے لگی۔

اس نے جلدی سے دروازے پر دستک دی تاکہ جیسے ہی دروازہ کھلے وہ گھر میں جا کر سفر کی تکان اتارے۔ ابھی اس کی ماں دروازہ کھول کر اس کا استقبال کرے گی۔ ماں کا شفیق سراپا اور ممتا بھرا چہرا اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ ماں کے پیچھے کھڑی اس کی بیوی والہانہ انداز میں اس کی منتظر ہوگی۔ یہ سوچ کر اس کے رگ وپے میں اس کے لمس کی رو دوڑ گئی، جیسے ہی وہ اندر داخل ہوگا۔ اس کے دونوں پھول جیسے بچے اس کی بانہوں کے گھیرے میں اس کی شفیق گود تک آ کر اس کی لطافتوں اور محبتوں کی پناہوں میں سما جائیں گے۔

وہ، اس کی ماں، اس کی بیوی، اس کے پھول جیسے بچے، اس کا گھر۔ تسکین، محبت، سکون، راحت، آرام۔ وہ تصور ہی تصور میں جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا مگر دروازہ ابھی تک بند تھا۔ اس نے پھر دوبارہ بے قراری سے دروازے کو کھٹکھٹایا۔ تیسری اور چوتھی بار دستک دی، مگر یہ کیا.........؟

دروازے نے اس کی دستک لینے سے انکار کر دیا۔ اس نے دروازے پر بے صبری سے کئی بار ہاتھ مارا، مگر دروازے سے کوئی

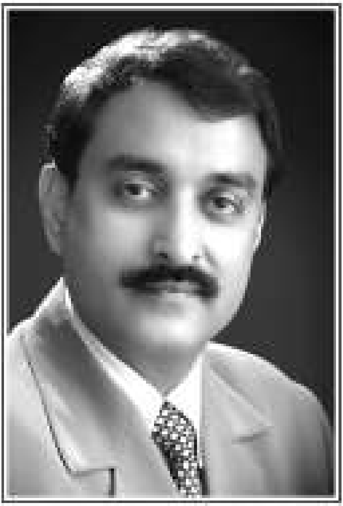

محمد اشرف کمال

آواز نہ ابھری۔ کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی نہ دی۔ پھر اس نے زور زور سے دو تین بار لگاتار دروازے کو جھنجھوڑا، مگر..........جواب ندارد۔ وہ اس عجیب صورتحال سے گھبرا گیا۔ اور دیوانگی کے عالم میں دروازے کو دونوں ہاتھوں سے پیٹنے لگا۔ اس شدت سے دروازے کو پیٹا کہ اس کے دونوں ہاتھ سرخ ہو گئے۔ ہتھیلیوں اور انگلیوں کی پوروں میں درد چیخنے لگا، مگر دستک۔ سعی لاحاصل کی طرح اس کا منہ چڑاتی رہی۔ دروازہ بدستور بند تھا۔ وہ حیرانی اور پریشانی کے عالم میں اپنے گھر کے چاروں طرف چکر لگانے لگا۔ شاید اندر جانے کی کوئی سبیل نکل آئے۔ شاید کسی روزنِ در سے اس کی آواز اندر مکینوں تک پہنچ جائے اور دروازہ کھل جائے۔ تھکن اور پریشانی کے گہرے احساس نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور گرفت میں لے کر ایسے جکڑا کہ اس کے جوڑ جوڑ سے درد کی لہر اٹھنے لگی۔ کچھ نامعلوم اندیشوں کا کرب رگ و پے میں سرایت کرنے لگا۔ سنسناہٹ گوشت سے ہوتی ہوئی وہ ہڈیوں میں اترتی محسوس کرنے لگا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے، وہ اپنے گھر کے اندر تھا۔

آہ......مگر یہ کیا۔۔!!

اس کے بیوی بچوں کو بے دردی سے مار دیا گیا تھا۔ وہ جیسے ہی اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی سب کتابیں، رائٹنگ میز، کمپیوٹر بے ترتیبی سے ادھر ادھر پڑے ہوئے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ اور سامنے صوفے کے قریب اس کا لاشہ بھی پڑا تھا۔ کسی شب زاد نے اس شب گزیدہ کی پشت میں خنجر گھونپ دیا تھا۔ گھر کا منظر بین کر رہا تھا، دیواریں سسکیاں لے رہی تھیں۔ وہ ایسے دردناک منظر کی تاب نہ لا کر شدتِ غم سے بے حال ہو کر باہر آ گیا اور کسی ہمدرد اور غم بانٹنے والے کی کھوج میں دربدر بھٹکتے ہوئے مکان در مکان دستکیں دیتا رہا لیکن کسی دروازے پر اس کی شنوائی نہیں ہوئی۔ آخر وہ تھک ہار کر روزانہ کے معمول کی طرح صبح ہونے سے پہلے پہلے اپنی قبر میں واپس آ گیا۔!!!

اس امید پر کہ اس کی سوچ زندہ رہے گی —

اس کے خون سے لکھے ہوئے لفظوں میں، دھڑکتے دلوں میں۔ لوگوں کے خوابوں میں، امید بھری آنکھوں میں۔ وہ برسوں ذہنوں میں گونجتا رہے گا، رگ و پے میں دوڑتا رہے گا۔ وہ زور زور سے چیخنے لگا.....

میں زندہ رہوں گا۔!!

میں زندہ رہوں گا۔!!

☆☆☆☆☆

سرخ پوشاکیں [مائیکروفکشن]

کنیز باھو

''اپنے ملک پہ سایہ فگن آسماں بھی اپنا ہوتا ہے'' کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد میں نے بیزاری سے کھڑکی بند کی اور لائٹ بند کر کے بستر پر ڈھے گیا۔ کھڑکی پر تیز ہوا کے تھپیڑوں سے سرسراہٹ ہونا شروع ہوگئی جیسے ہوا کواڑوں کو چیر کر زبردستی اندر داخل ہونا چاہتی ہے۔

''تمہیں کہا تھا کان اور آنکھیں کھلی اور زبان بند رکھنا۔'' یہ سرسراہٹیں سماعتوں پر بم کی طرح گر رہی تھیں۔ دھندلے مناظر سے باغی آنکھیں شعوری طور پر کھلے رہنے کی سزا میں اندھی ہوچکی تھیں جن سے نیند روٹھ چکی تھی۔

میں نے آنکھوں کو نرمی سے مسلا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ کمرے کی خالی دیواریں اور اندھیرا مجھے لرزا رہا تھا۔

دفعتہً اندر سے آواز آئی----

''نیند موت کا دوسرا نام ہے۔ اگر بصیرت کو بصارت دھندلا دے تو زندگی کا باغی کب تک بچ پاتا ہے--- آہ---

''یہ سوئیاں پھر مجھے چھبنا شروع ہوگئیں۔''

یہ میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتیں اب تو نہ زمیں اپنی نہ آسماں---میں نے وحشت سے آنکھیں بند کرلیں اور سر گھٹنوں میں دبا لیا۔ مناظر وقت کی قید سے آزاد ہو کر میرے سامنے فائلوں کی طرح کھل گئے۔

اپنے کیریئر میں قدم رکھا تو میرا واسطہ مجبوریوں کی رسی میں بندھی بے بس زندگیوں سے پڑا۔ میں کالے کوٹ میں ملبوس ہاتھوں میں فائلوں کا پلندہ تھامے وہاں اکثر بے بسوں کا تماشہ دیکھتا، جانتا تھا میری زبان ہی ان کے لیے مژدہ جانفزاں لاسکتی ہے۔ لیکن کالے کوٹ نے میرے اندر لکیر کھینچ کر مجھے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا جس کے پار بس اپنے سر کا ہی کھلا آسماں نظر آتا۔ میں اکثر کوٹ پر اطمینان سے نرم ہاتھ پھیرتا اور منظروں سے نظریں چُرا لیتا۔ مجھے کھلے آسمان میں پرواز کرنی تھی۔

بام پر لٹکتی سُرخ پوشاکیں بے بسی کے نوحے سنا رہی تھیں۔ ''خاموش ہوجاؤ خدا کے لیے مجھے سوئیاں چبھ رہی ہیں۔'' میں پوری قوت سے دھاڑا اور اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

دائیں دیوار کے پاس لٹکتی پوشاک سے

چنگاریاں نکلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

''وہ خود گرا تھا یہی الزام لگایا تھا تم نے۔''

آگ کا شعلہ پوری قوت سے بھڑکا، میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

''یہ تو وہی چنگاریاں ہیں جو میں کمزور سمجھ کر دبا دیا کرتا تھا ---اففففف...-- یہ شعلہ بن گئیں۔'' میں زمین پر ہتھیلیاں جما کر خود کو پیچھے گھسیٹ رہا تھا۔

شعلہ گرجدار آواز کے ساتھ بھڑک کر میری طرف لپکا جس میں نظر آنے والا چہرہ دیکھ کر میں خوف سے کانپ اٹھا۔

''بھٹے پر کام کرنے والے مزدور کو مالک نے غصے میں گرم بھٹے میں پھینک کر زندہ جلا دیا تھا۔اس کے بیوی بچوں نے یہ کربناک منظر دیکھا لیکن بے بسی کی تصویر بنے کھڑے رہے۔

تیسری فائل پر لکھی کہانی پڑھ کر میں مسکرایا تھا چونکہ بیوی اور بچوں کی گواہی مانی نہیں جاتی اور کسی کو کیا پرائی آگ میں کودنے کی۔

ان پر زمین تنگ ہوگئی تھی اور میرا آسمان وسیع ہوگیا۔ بیچاری زبان نے اپنے معبود کے سامنے سا جھکا کر اٹل دلیل پر جرح سمیٹی ''بندہ اپنی غلطی سے گرا تھا۔'' کوٹ پر ہاتھ پھیر کر میں مطمئن تھا۔

''میں جلنا نہیں چاہتا--- ممم-- مجھے مت جلانا--- پلیز--- ہاں! میں مانتا ہوں کوئی خود نہیں جلتا۔''

''جب جھوٹ زندگیاں نگل چکا ہو تو زبان کے سچ اگلنے کا کیا فائدہ--- یہ تیسرے جہنم کی آگ تمھاری ہی جلائی ہوئی ہے۔''

ہوا کی بازگشت سے یہ الفاظ میرے منہ پر طمانچہ کی طرح لگے۔ میرے اندر اٹھتے اُبال کی وجہ سے رگوں میں خون کی رفتار کم ہوگئی۔ کمرے کی حبس زدہ فضا میں گہری سانس لی اور سختی سے تنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ کچھ دیر تک ہمت مجتمع کی اور اٹھ کر کھڑکی کھولنے لگا۔

تو گردن پر بوسیدہ پوشاک کا پھندہ ڈال کر کسی نامعلوم قوت نے مجھے اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ بدبو کے بھبکے میری سانس کے ذریعے اندر داخل ہو کر دماغ سمیت تمام اعضا کو جامد کر رہے تھے۔ میرا سانس بند ہونے شروع ہوگیا اور بدن میں سوئیاں چبھنے لگیں۔

''اوہ! یہ بدبو تو میرے اندر سے اُٹھ رہی ہے۔''

مجھے بادِ مخالف کا مقابلہ کرتے ہوئے اونچی اڑان سکھائی گئی تھی۔ کاغذ کے ٹکڑوں پر بیٹھ کر میرا قد اتنا اونچا ہو چکا تھا کہ مجھے سب پستی پر چلتے کیڑے مکوڑے نظر آتے جن کی زندگیاں فائلوں میں قید تھیں--- فائل کو سوئیوں کی قید سے آزاد کر کے جس طرف پر اڑاؤں ہوا اسی رُخ پہ چلتی تھی۔

''تم مرد ہو تمھارے لفظ ہی اسے بدکردار

ثابت کرنے میں کافی ہوں گے۔'' دوست کی بیوی کو طلاق دلوا کر میں اپنے کوٹ پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

ہوس جگانے والی مست ہوا کی خوشبو نے میرے سوچنے سمجھنے والے تمام مسام بند کر دیے تھے۔ اُسے پانے کے لیے کردار کی فصیل سے آزاد کروانا ضروری تھا۔ میں نے ہوا کا رُخ اس طرح سے موڑا کہ اُس بے قصور عورت پر زمیں تنگ ہو گئی کبھی کبھار ہوش میں اس کی گود میں چند سکے زندگی کے اچھال دیتا۔

میری ضرورتوں کا مقناطیس اتنا طاقتور تھا زندگی اور موت کی جنگ میں انصاف کے تقاضوں سے میرا وقت کا ترازو ہمیشہ میری ضرورت کے مطابق جھک جاتا۔

آج ہر ترازو میری موت کی طرف جھک رہا تھا۔

کم سن طلبا کی خون آلود پوشاکیں میرے سر پر ہتھوڑے برسانا شروع ہو گئیں۔

ہتھوڑے کی ضربیں میری رگوں کو چیر کر مجھے آہوں اور سسکیوں بھری اُس تباہ شدہ بستی میں لے گئیں جہاں سینکڑوں معصوم زندگیاں بے رحمی سے دہشت گردی کا نشانہ بنی تھیں۔ میں نے بھاری رقم کے عوض زبان بیچ کر دہشت گردوں کے سرغنہ سے اپنے خاندان کے تحفظ کا سودا کیا تھا۔ ''خودکش حملہ آور ذہنی معذور تھا۔'' سوچی سمجھی سازش ترتیب دے کر ڈاکٹروں کے پینل سے باہمی مفاہمت کے بعد میں نے بیان دے دیا اور جھاگ بیٹھنے سے پہلے ملک سے فرار ہو گیا۔ سُرخ پوشاکیں دائروی گردش میں مجھ پر بھاری ضربیں لگانے لگیں۔

مسلسل ضربیں مجھے اچھال کر بار بار زندگی اور موت کے درمیان معلق کر رہی تھیں۔

میں زمین میں دھنسا جا رہا اور آسمان پوری قوت سے مجھ پر گر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا بہت جلد اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھوں گا۔ کمرے سے نکل کر میں نے بے سمت بھاگنا شروع کر دیا۔ میں موت سے نہیں بھاگ رہا تھا، زندگی کا باغی تھا میری سزا ختم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

'' صاحب کل پیشی کی آخری تاریخ ہے۔ ملک کا دیوالیہ کرنے والے قبیح انسان کا چہرہ دنیا کے سامنے لانے میں آپ کا کردار بہت اہم ہے۔''

'' ٹھیک ہے۔ میں کل کی فلائٹ سے واپس آ رہا ہوں تمام ثبوت اور ہسٹری تیار رکھنا۔''

اپنے سیکرٹری کو پیغام دے کر کال بند کی۔

اپنی گروی زبان آزاد کرا کر زندگی میں پہلا کیس ایسا لڑا جس نے میری پوشاک میلی کر کے مجھے تا عمر سلاخوں میں قید کر دیا۔ لیکن میں مطمئن تھا اب مجھے نہ بدبو آتی تھی نہ سوئیاں چبھتی تھیں۔

☆☆☆☆☆

روزن دید

وہ دیوار سے ٹیک لگائے ایک بار پھر اس مدھر سی مسحور کن آواز کے سحر میں کھوئی ہوئی ہوش وخرد سے بیگانہ ہو چکی تھی۔ نہ جانے وہ کون تھا جو شام کے اس پہر اپنی خوب صورت دل کو گداز کر دینے والی آواز کا سحر پھونکا کرتا تھا۔ وہ جانے ان جانے اس کی منتظر رہنے لگی تھی۔ وہ مہربان اجنبی اس کی ٹھہری ہوئی ساکت سی زندگی میں ہلچل پیدا کر دینے والا کنکر تھا جس کی آواز اسے اپنے ارد گرد چند لمحوں کے لیے سہی زندگی کے ہونے کا احساس دلاتی تھی ورنہ وہ تو نہ جانے کب کی اپنے سپنوں اور آرزوؤں کے ساتھ مٹی کا ڈھیر بن چکی ہوتی۔

گزشتہ دو سال سے یہ چار دیواری اس کا مسکن تھی۔ باہر کی دنیا سے اس کا ہر تعلق ختم ہوئے دو سال چار ماہ آٹھ دن اور بارہ گھنٹے ہو چکے تھے لیکن یہ حساب اس نے نہیں لگایا تھا اسے تو ماہ و سال کا حساب بھول چکا تھا۔ برسات اور پت جھڑ سے واسطہ ٹوٹے نہ جانے کتنا وقت گزر چکا تھا۔ آس اور انتظار کا ہر موسم اس کے لیے بیت چکا تھا کچھ باقی تھا تو فقط تنہائی۔ وہ تو یہ بھی نہ جانتی تھی کہ کس جرم کی پاداش میں وہ اس زندان میں بھری جوانی کے دن کاٹ رہی ہے۔

سولہ سال کی ہوئی تو باپ نے عمر میں کئی سال بڑے تایازاد کے نکاح میں دے دیا۔ سہیلیوں نے اس کے نام سے چھیڑنا چاہا تو اس جانے پہچانے لیکن غیر مانوس نام سے دھڑکنوں میں کوئی ارتعاش پیدا نہ ہوا۔ وہ ساکت سی ہتھیلی پر لگی مہندی کو دیکھتی رہی۔ اس کی معصوم سی آنکھوں نے تو ابھی خواب بننا بھی نہ سیکھے تھے، حسین جیون ساتھی کو پانے کی آرزو نے ابھی آنکھوں سے نیندیں بھی نہ چرائی تھیں۔ دل گداز کر دینے والے جذبوں سے انجان وہ ایک کی حق ملکیت سے نکل کر دوسرے کی ملکیت میں چلی آئی، اس کے لیے تو فقط اس کا حق دار بدلا تھا زندگی تو سانسوں کی اسی بے رونق پگڈنڈی پر رینگ رہی تھی۔ شادی کے حقیقی معنوں سے وقف ہوتی اس سے قبل ہی سہاگ اجڑ گیا، بنا سہاگن بنے ہی بیوگی کی چادر اوڑھ لی اور ملک اللہ یار کی بیوہ بن کر حویلی کے عقب میں بنے زندان خانوں میں سے ایک میں لا کر پھینک دی گئی۔

اپنے نصیب کو روتی یا حیران ہوتی اپنوں کی سنگ دلی پر۔ وہ سیاہ نصیب تو اپنے قصور سے بھی واقف نہ تھی۔ جب تنہائی سے گھبرا کر ماں کو پکارا، رات کے اندھیرے میں باپ سے التجا کی لیکن جب کوئی سنوائی نہ ہوئی تو اس نے رو رو کر اپنے بخت کی سیاہی کو مقدر کا لکھا جان کر اپنی مانگ کا ٹیکا بنا لیا۔ عورت تو یوں بھی صبر کی مورت ہوتی ہے۔ وہ بھی صابر بن گئی۔ لب سی لیے، آنکھیں خشک ہو گئیں اور پھر ایک دن اس ٹھہری ہوئی جھیل میں ایک پتھر آن گرا جس سے نہ صرف پانی میں ہلچل ہوئی بلکہ اس کے وجود میں سوئی امنگیں، خواہشیں انگڑائی لے کر یوں بیدار ہوئیں کہ وہ خود بھی سمجھ نہ پائی۔

اپنے قبیلے کے رواج کے مطابق وہ نیلی حویلی کے

مریم صدیقی

عقب میں بنی زندان نما کوٹھڑیوں میں سے ایک میں قید تھی۔ رسم کے مطابق اسے تمام آسائشات، رشتوں اور ہر شے کو تیاگ کر یہاں اس چھوٹے سے کمرے میں زندگی کے بقیہ دن بسر کرنے تھے۔ کھلکھلاتے لبوں پر ہنسی کی جگہ گہری چپ نے لے لی تھی، آنکھوں میں جلتی محبت کی جوت کی جگہ ویرانی نے لے لی تھی۔ شب و روز اپنی واحد سہیلی کے ساتھ بسر کرنے لگی اب فقط وہ اور اس کی تنہائی تھے۔ کبھی دیواروں کو تکتی تو کبھی آہنی دروازے کو ٹٹولتی۔ کئی کئی دن اپنا نام یاد کرتے گزار دیتی۔ کبھی ماں باپ کی بھولی بسری شکلیں یاد آتیں تو وہ خوف سے چیخنے لگتی۔

نہ جانے کتنے موسم بیتے، کتنی بہاریں خزاؤں میں تبدیل ہوگئیں، اس کی آنکھیں اپنوں کے دیے زخم کو اشکوں سے سیتے سیتے خشک ہوگئیں لیکن کسی کو اس کی یاد نہ آئی۔ اسے کھانا دینے والی ملازمہ مقررہ وقت پر خاموشی سے دروازے کے باہر ایک خاکی لفافہ رکھ جاتی جس میں اس کا کھانا اور ضرورت کا سامان ہوتا۔ وہ ان سالوں میں اسی شب و روز کی عادی ہوگئی تھی۔ اس کے اندر سے اپنا جرم جاننے کی جستجو بھی دم توڑ چکی تھی۔ وہ حالات کی بیڑیوں کے آگے سر جھکائے خود کو سزاوار تسلیم کرچکی تھی لیکن آزمائشوں کے سلسلے تھمے نہ تھے۔ ابھی امتحاں اور بھی تھے۔ کئی روز سے وہ کشمکش میں مبتلا تھی۔ جستجو ایک بار پھر اس کے مردہ وجود کو جھنجھوڑ رہی تھی۔

وہ ایک عام سا دن تھا، رات بھر برستی بارش نے ماحول کو خوشگوار کردیا تھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی کہ دور کہیں سے دھیمی دھیمی بانسری کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ اپنی تمام تر حسیات کے ساتھ اس آواز کی جانب متوجہ ہوئی۔ اس نے بے چینی سے دیوار کو ٹٹولا شاید اس پار بیٹھا شخص اس کی موجودگی کو محسوس کرلے۔ اب وہ کچھ گنگنا رہا تھا اور اس کی سریلی آواز اس کی سماعتوں میں رس گھول رہی تھی۔ چند ہی لمحوں میں اس کی بے چینی جاتی رہی اب وہ پرسکون ہوگئی تھی۔

نہ جانے کیسے وہ مہربان شخص حویلی کے اس عقبی حصے کی جانب آنکلا اور اپنی مدھر آواز سے اسے اپنی جانب متوجہ کیا، یوں لگا کہ برسوں بیت گئے ہوں کسی آدم زاد کی آواز سنے ہوئے۔ وہ بنجارا بھی نہ جانے کیوں روز اپنی بانسری لیے اس طرف چلا آتا تھا دھیرے دھیرے وہ اس کی اور اس کی بانسری کی آواز سننے کی عادی ہوتی چلی گئی، عادت نے انتظار کے در پر دستک دی، انتظار نے توجہ کو پناہ دی، توجہ چپکے سے محبت کو ہم راہ لیے دل کے کواڑ پر آن کھڑی ہوئی۔ محبت پر فلسفے رقم کرنے والے ششدر رہ گئے کیا محبت ایسے بھی ہوتی ہے۔ یہ کیسی محبت تھی جو بنا چاپ دل کے کواڑ خانوں میں اپنی جگہ بناگئی۔ وہ لب جو مسکرانا بھول گئے تھے ایک بار پھر مسکرانے لگے تھے، آنکھوں میں امید کی جوت پھر سے جلنے لگی تھی۔

محبت نے دید کی خواہش کی تو وہ روزن کی تلاش میں ہاتھ پیر مارنے لگی۔ کمرے میں اوپر کی جانب بنا واحد روشن دان جہاں سے روشنی چھن کر آتی تھی اب وہاں سے محبت کی برسات بوند بوند برسنے لگی تھی لیکن آنکھوں کی پیاس بجھنا اس سے ممکن نظر نہ آتا تھا۔ لاکھ کوششیں کی، لیکن بے سود تھک ہار کر ایک بار پھر قسمت کے در پر گھٹنے ٹیک دیے۔ روزن دید کی تلاش چھوڑ محبت کی اس کسک کو متاع حیات جان لیا۔

☆☆☆☆☆

اے مرے خوابوں کے حرم

تُو مری آس کا دریا، مری اُمید کا نم
اے مرے پاک وطن! اے مرے خوابوں کے حرم
حِدّتیں دیں مرے افکار کو پل پل ترے صحراؤں نے
شدّتیں دیں مرے جذبات کو دَم دَم ترے دریاؤں نے
مرا آفاقِ ہُنر چمکائے

تیرے صحراؤں کی وسعت، ترے دریاؤں کا رَم
اے مرے پاک وطن! اے مرے خوابوں کے حرم
آج اک عظمتِ رفتہ کی جھلک ہے، مری تدبیروں میں
اے وطن! اب مرے خوابوں کی چمک ہے، تری تعمیروں میں
مرا آفاقِ نظر مہکائے

اک گُلِ جذبۂ تعمیر قدم تا بہ قدم
اے مرے پاک وطن! اے مرے خوابوں کے حرم
رنگ پائے رُخِ تہذیب نے کیا کیا؟ ترے معیاروں سے
خیر مانگے گا تمدّن! ابھی صدیوں ترے میناروں سے
دھوپ نکلی، کبھی بادل چھائے

تیری مٹی پہ رہا یُوں مرے مولا کا کرم
اے مرے پاک وطن! اے مرے خوابوں کے حرم!

خالد احمد

خالد احمد کے نام

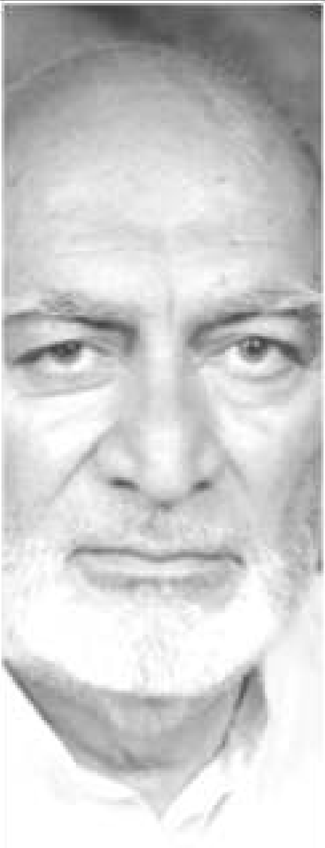

ملیں گے لوگ کہاں سے وہ پوچھنے والے
گزر گئے ہیں جہاں سے وہ پوچھنے والے

بغیر اُن کے یہاں محفلیں نہیں جمتیں
گئے ہیں ایسے مکاں سے وہ پوچھنے والے

جو، اب تو ہم سے ملاقات بھی نہیں کرتے
ڈرے ہیں آہ و فغاں سے وہ پوچھنے والے

نکل گئے ہیں کہیں جنگلوں کو سب کے سب
الگ ہیں کب کے یہاں سے وہ پوچھنے والے

جدا ہوئے تو ہوئی شورشِ گماں پیدا
ملے تھے امن و اماں سے وہ پوچھنے والے

ہمارے حال سے صرفِ نظر کبھی نہ کیا
رواں تھے حسنِ بیاں سے وہ پوچھنے والے

یقین کرنے کو کوئی نہیں رہا ثاقب
بدل گئے ہیں زباں سے وہ پوچھنے والے

آصف ثاقب

قوم ہاری نہیں

دیکھ!
سازش تو ہے
آج کی کب ہے
برسوں سے جاری ہے
''توسیعِ مکروہ'' کے دن سے لیکن
یہ کچھ اور بھاری ہے

دنیا سے پیاری
مری پاک دھرتی پہ بہتے
تجاوز کے لاوے
بدی کے بڑھاوے کے
مجرم سبھی ہیں

ہزیمت ہے اُن کی
یہاں اصل جو فیصلہ ساز ہیں
جو سمجھتے ہیں
ہر مسئلہ
اُن کی فائق فطانت
کا محتاج ہے
جن کے من کا تھا کل،
موہ کا آج ہے
مستقل جن کا پس منظری راج ہے

اور ملامت لدی ہاران کی
جنہیں کھوکھلی بانجھ آفاقیت
اپنی زرتاب و تہہ دار پہچان کی،
اپنے نایاب جوہر کے عرفان کی
راہ سے روکتی ہے
زمیں جن کی مجہول دانش کا
گُھن بھوگتی ہے

شکست اُن بِکے ماہروں کی
کہ جن کے بڑے مستعد ذہن ہیں
لیکن اہلیتیں رہن ہیں
جن کی گدلی نجس نیتوں کے سبب
آفتوں کے ہدف اپنے گھر صحن ہیں

ذلتوں سے بھری مات ان کی ہے
جن کے سیہ کار ہاتھوں
توازن ترازو کا پامال ہوتا رہا
لحہ لحہ اذیت اٹا سال ہوتا رہا
حال ماضی سے بھی بڑھ کے
بدحال ہوتا رہا

ناک کٹواتی ناکامیاں
ان سیاست گروں کی

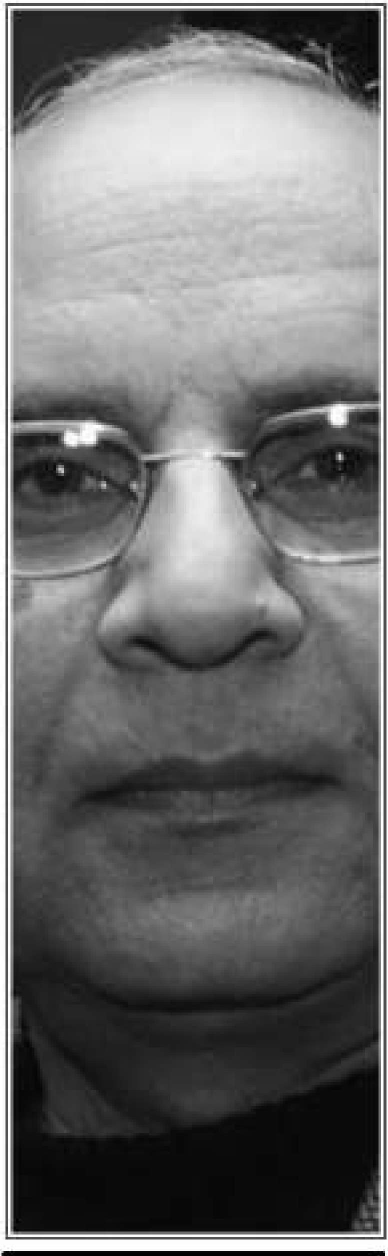

جلیل عالی

جنہیں خاک زادوں کے سینوں کی
دھڑکن نہیں،
نوبتِ جبر و قوت سے
ہم صحبتی کا جنوں ہے
عجب سامرانہ فسوں ہے
درون و بروں جوں کا توں ہے
نہیں، اور بھی کچھ زبوں ہے

سبھی کی خطاکار سوچوں پہ اب
وقت کی دُھول ہونے کا
آسیب طاری ہے
لگتا ہے طاقت کی
پوری کلب یاس ماری ہے
ہلکے سے عکسِ رجا سے بھی عاری ہے

لیکن چھتوں، گلیوں، بازاروں،
میدانوں، تعلیم گاہوں سے
سارے کشیدہ سروں کا یہ اعلان ہے
بے حمیت بھکاری ہوئے
ایسے بالانشینوں کے ساتھ
اپنی یاری نہیں
جنگ ہارے ہیں وہ
قوم ہاری نہیں

مناجات

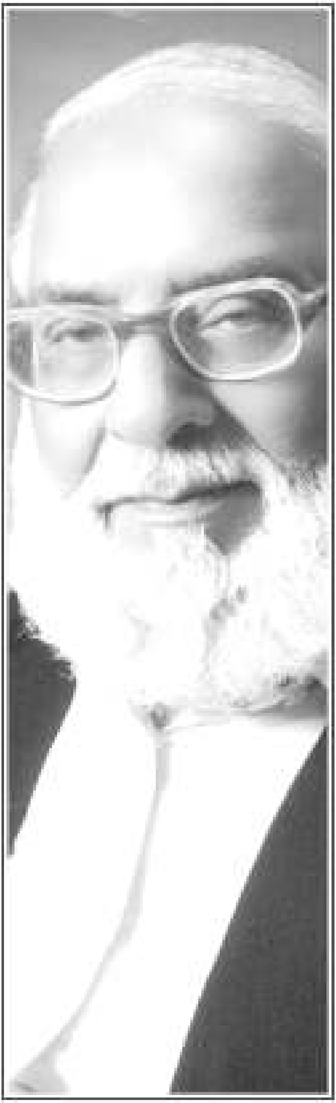

سید ریاض حسین زیدی

اے خدا! من بھانولے میرے خدا
کون ہے میرا یہاں تیرے سوا
کوئی بھی رکھتا نہیں ایسی سکت
تو تن و من کا ہے میرے آسرا
استقامت سے مجھے معمور کر
میں ہوں سطحِ آب پر اک بلبلہ
عزم ہو، بالجزم، بے حد، بالیقیں
بدگمانی کا نہ پاؤں راستہ
غیرت عز و شرف ہو ہم نشیں
ہو دلِ خرم حمیت یافتہ
کیوں ڈرے کوئی کسی بھی غیر سے
جو خدا کے خوف سے ہے کانپتا
نورِ ایماں ہو درخشاں ہر طرف
مہرِ دانش سے نہ ٹوٹے رابطہ
کاروبارِ روزمرہ ہو روا
بدنما رستہ نہ ہو آراستہ
رونمائی ناروائی کی نہ ہو
بے ادب سے دل نہ رکھے واسطہ
بے رخی، بے کار ہے، بے سود ہے
خندہ پیشانی کا ہو اظہاریہ
مجھ ریاضِ خستہ جاں پر ہو کرم
سرخ رو ہو جائے میری ہر دعا

گئے وقتوں کی ایک کہانی [نثری نظم]

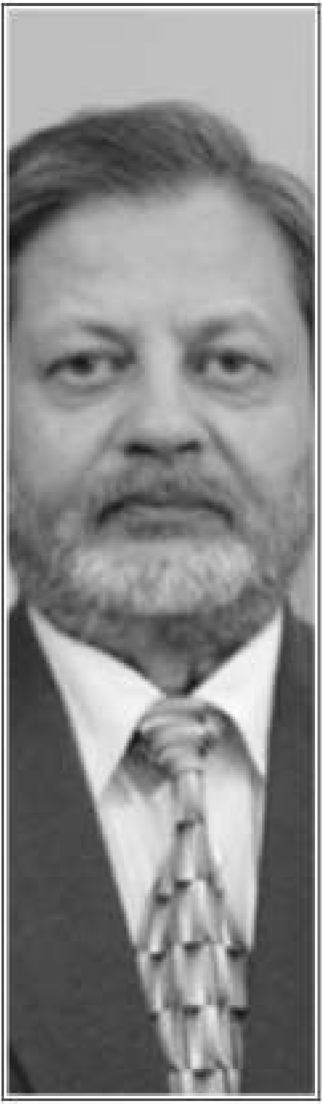

خاور اعجاز

سمرقند کے سیاہ فام غلام
ابوالحسن شہریار
کے خفیہ دروازے سے
دھواں دھواں عفریتوں کی صورت میں برآمد ہُوئے
اور کھجوریں کھاتے ہُوئے مچھیرے کے
مردہ گدھے کو
مٹی کے مرتبان میں ڈال کر
موچی، درزی اور لکڑ ہارے کے بیچ
پھینک کر غائب ہو گئے
آٹھویں صدی کا علی بابا
ایک ہزار ایک راتوں سے
خفیہ دروازے کو اندر سے کھٹکھٹا رہا ہے
لیکن مٹی کے مرتبان میں حنوط شدہ بدن
ساکت ہے
اور موچی، درزی اور لکڑ ہارا
گہری نیند میں غلطاں ہیں
آخر اِس کہانی کا انجام کیا ہوگا؟

نثار پر سب محبتوں کو نثار کر دوں

ادب میں سچی وضاحتوں کا امین ہوں میں
مری گواہی میں میرے اندر کی ہر صداقت کا عکس جھلکے
مَیں ایسے ویسے لکھاریوں کو خراج دینا گناہ سمجھوں
جو سستی شہرت کے خیر خواہ ہوں
مگر وہ شاعر!
جو اپنے لفظوں میں اُس حقیقت کا رنگ بھر دے
جو جھوٹ کی سب بشارتوں کو ملول کر دے
مرے قلم کا سلام اُس پر
قصیدہ گوئی مرے قلم کی زباں نہیں ہے
کہ میں فراز اور ایوب صابر کے شہر کا وہ کوی ہوں
جس نے
کسی ستارے کو سورجوں کی صفوں میں لانے سے پہلے سوچا

کہ اس کی کرنوں کا ماسکہ کس مقام پر ہے
میں قد کو سائے کی اور سائے کو قد کی نسبت سے ناپتا ہوں
میں جانتا ہوں مبالغوں کا وجود اندر سے کھوکھلا ہے
کلامِ غالب کی مجھ سے لے لو قسم کہ میں نے
چمکتے سورج کی روشنی کو چراغ کی ملگجی ضیا سے
شکست دینے کی آرزو کو فریب ظرفِ حیات سمجھا
میں زندگی کو حقیقتوں کے قریب لا کر پرکھنا چاہوں
مرے قلم نے قدم قدم پر محبتوں کو غرور بخشا
قصیدہ لکھنا گناہ سمجھا
مگر ادب کے عظیم لوگوں کو میں نے اپنا خراج دے کر
قلم کو سچا وقار بخشا
مجھے تو آپ کی عاجزی پہ ہیں مان لاکھوں
نثارؔ پر سب محبتوں کو نثار کر دوں
یہی وہ شاعر ہے جس نے سوچوں کا عکس
لفظوں کے آئنوں میں اُتارنے کا کمال پایا
مرے خدایا اس ایک نخلِ ادب کی شاخوں کو
زرد موسم نہ چھونے آئے
کہ اس کی سرسبز ٹہنیوں پر
لطیف پتوں کا رقص دیکھوں

سورج نرائن

نظم

آج میرا لاہور مر گیا [خالد احمد صاحب کے لیے]

میرا لاہور
تمھارے سگریٹ کے دھویں سے شروع ہو کر
لکشمی چوک کی خوابگوں فضا میں چکراتے،
چھپاتے تمھارے قہقہوں پر ختم ہو جاتا تھا
مجھے کیا خبر تھی کہ یہ قاتل دھویں کے مرغولے
ایک دن تمھارے روشن قہقہوں کے اردگرد
موت کا ایک کالا جال بن دیں گے
کنور امتیاز احمد بول ارشد شاہین بتاؤ
لکشمی چوک کے خالی کشکول میں
اب اتنے چمکدار لفظوں کے سکے کون ڈالے گا
لاہور تو کنگال ہو گیا
میرا وہ لاہور جو تب سوتا تھا
جب تم سوتے تھے
اور تب جاگتا تھا جب تم جاگتے تھے
میں جانتا ہوں قاتل دھواں تمھاری
زبان بند کر سکتا ہے
مگر تمھاری آواز کو قتل نہیں کر سکتا
اور تمھارے مضبوط قہقہے کو کسی موت کا
جال گرفتار نہیں رکھ سکتا
آج تم بھی اپنی انگلیوں کے لمس سے
زندہ ہو جانے والے کاغذوں پر ہنستے ہو
پگ پگ رنگ اگائے، چھب اک چنچل
چال کی بل کھا کر رہ جائے
رنگلی کھیڑی کھال کی میں کسی کو تمھاری
آواز کی کرامت کیا سمجھاؤں
تمھاری تو ایک سرگوشی بھی جنم جنم کی ودوا
خاموشیوں کی مانگ میں سیندور بھر دیا کرتی تھی
آج لاہور کی راتوں کے پچھلے پہروں کی
سنسان گلیوں کا سہاگ اجڑ گیا
آج میرا لاہور مر گیا
اب تو مجھے لگتا ہے لندن ہی سے تمام عمر اپنی سسکیوں
اور آہوں پر خط لکھ کر تمھیں بھیجنے پڑیں گے
مگر ایسے مہاجر خطوں کا جواب کب آتا ہے

علی ارمان

پاک فوج کے لیے

نثار خاکِ وطن پر ہوئی جوانی تری
خدا نے کر دی قلمبند جاودانی تری

شجاعتوں کے جو قصے کہانیوں میں پڑھے
ہماری آنکھ نے خود دیکھ لی کہانی تری

وطن پہ پڑنے نہیں دی عدو کی میلی نظر
یہ قوم بھول سکے گی نہ مہربانی تری

وگرنہ اتنے محاذوں پہ جنگ ناممکن
مدد کہیں سے تو ہوتی ہے آسمانی تری

فضا میں اُڑتے ہوؤں کو بھی زیرِ دام کیا
ہوئی ہے برف پہاڑوں پہ حکمرانی تری

پہنچ گیا ہے تو سیلاب کی تباہیوں تک
بپھرتی لہر نے ہر ایک بات مانی تری

اُٹھائے سر کو کھڑی فخر سے شہید کی ماں
خبر جو پہنچی تھی اک روز ناگہانی تری

پہن کے پھرتا ہے ہر روز تیرے بھاری بوٹ
یہ ننھا منا سپاہی حسیں نشانی تری

لگائے رکھتی ہے سینے سے وہ تری تصویر
نہ بھول پائی کوئی یاد بھی سہانی تری

سلام کرتی ہے رخشندہ اس دعا کے ساتھ
کہ گاڑتی رہے جھنڈے یہ کامرانی تری

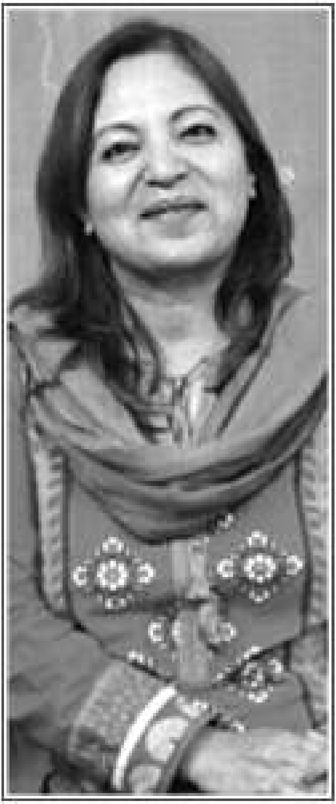

رخشندہ نوید

چھ ستمبر

ظلمت کے جزیرے سے اندھیروں کے رسالے
آئے تھے دبے پاؤں ارادوں کو سنبھالے

دُشمن کے قدم کی جو پڑی کان میں آہٹ
جاگے تھے مری قوم کے خوابیدہ جیالے

توحید کے فرزند رسالت کے مجاہد
ٹیپو تھا کوئی اُن میں کوئی طارق و خالد

جب شوقِ شہادت میں بڑھی اُن کی سواری
شیشے کی طرح کٹ گئے پتھر کے پُجاری

گونجی تھی مجاہد کی اذاں کھیم کرن میں
نصرت کی بہار آ گئی گلزارِ وطن میں

رانی کے نشانے پہ گھمنڈی کا جہاں تھا
خود اپنی چِتا بھارتی لشکر کا جواں تھا

افواج کا دُشمن کی سُلگتا ہوا سینہ
بھولا ہے نہ بھولے گا ستمبر کا مہینہ

سینچا تھا گلستاں کو شہیدوں نے لہو سے
نکھری تھی نئی صبح محبت کی نمو سے

لِکھی تھی سحر جس نے یہ تاریخِ ستمبر
اُس جذبۂ احرار کی ہیبت ہے عدو پر

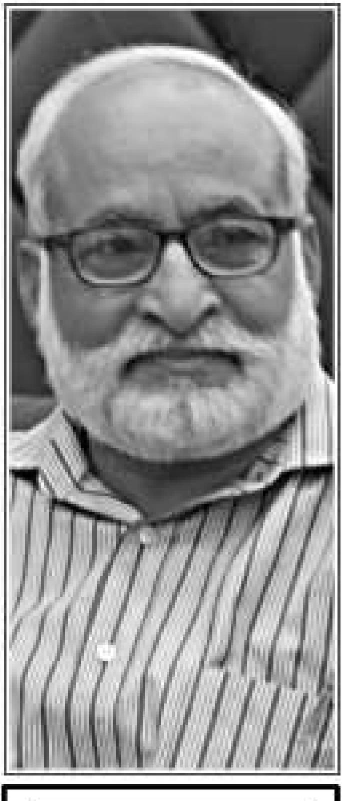

اکرم سحر فارانی

ہائے

تم جو چاہو تو غزل تم کو سناؤں اپنی
ذکر تھا تم سے ملاقات کی حسرت کا اویس
جس کا ہر شعر دھواں بن کے اٹھا تھا دل سے
تذکرہ جبکہ چھڑا درد کی شدت کا اویس

تم جو چاہو تو غزل تم کو سناؤں اپنی
جس کے ہر لفظ سے برسات برس پڑتی تھی
بحر ایسی تھی غزل کی کہ قیامت ڈھا دے
پیاس مصرعوں کی کسی دشت کا ٹکڑا لگتی

تم جو چاہو تو غزل تم کو سناؤں اپنی
آتشِ حزن میں سب شعر جلے جاتے تھے
زخم پتھر کی طرح دل پہ برستے لیکن
لفظ شعروں کے جو اشکوں میں ڈھلے جاتے تھے

تم جو چاہو تو غزل تم کو سناؤں اپنی
استعارے تھے غضب آگ کا شعلہ جاناں
ہجر کے ہاتھ رنگے خونِ جگر سے اکثر
نوکِ خنجر پہ کبھی دل کو بھی تولا جاناں

تم جو چاہو تو غزل تم کو سناؤں اپنی
آگ پانی میں لگی اور بجھائی نہ گئی
چاند جب جھیل میں اترا تو کنارے پہ رہیں
دل نے چاہا تھا سنائے پہ سنائی نہ گئی

تم جو چاہو تو غزل تم کو سناؤں اپنی
جس کے چھڑنے سے صراحی بھی چھلک پڑتی تھی
لمحہ لمحہ شبِ فرقت کا ٹھہر جاتا تھا
جام در جام تمنا کی جھلک پڑتی تھی

تم جو چاہو تو غزل تم کو سناؤں اپنی
ذکرِ غم سے تو کلیجہ بھی پھٹا پڑتا تھا
چاندنی چھن کے درختوں پہ بکھر جاتی تھی
چاند افلاک پہ پژمردہ ہوا جاتا تھا

تم جو چاہو تو غزل تم کو سناؤں اپنی
تان دیپک کی وہی پھر سے اٹھاؤں اپنی

اویس الحسن

مسعود احمد...... عہدِ حاضر کا منفرد سخن ور

عہدِ حاضر کے جو سخن ور ہیں
ان میں مسعود نام کا شاعر
مجھ کو سب سے جدا سا لگتا ہے
وہ سخن کا خدا سا لگتا ہے
اس کی معجز بیانیوں کا طلسم
حیرتوں کے جہاں سجاتا ہے
سب کو گرویدہ وہ بناتا ہے
پھول، کلیاں، گلاب، خواب، دھنک
اس کے شعر و سخن میں سج سج کر
اوڑھ کر حرف جگنوؤں کی چمک
تتلیاں دیکھ کر سخن کی لپک
کہکشاؤں تلک پہنچتی ہے
شہد کانوں میں سب کے گھولتی ہے
اس کے شعر و سخن کی رفعت کو
سارے جھک کر سلام کرتے ہیں
عظمتیں اس کے نام کرتے ہیں
اس کی بحریں سخن کی لہریں ہیں
موجزن ان میں فن کی نہریں ہیں
بے مثال اس کی ساری ترکیبیں
فن کو بخشی ہیں اس نے تہذیبیں
استعارات ہوں کہ تشبیہات
ضرب الامثال ہوں محاورے ہوں
ہو نئی یا زمین ہو پامال
ان میں دکھلاتا ہے وہ فن کے کمال
اس کے الفاظ یوں چمکتے ہیں
جیسے مہتاب سے دمکتے ہیں
منتخب سارے قافیے اس کے
منفرد سارے زاویے اس کے
اس کے سارے حسیں قرینے ہیں
موتیوں سے جڑے نگینے ہیں
اس کے اشعار سارے ہیں شہکار
منفرد اس کے سارے ہیں افکار
فن کا سورج ہے وہ چمکتا ہے
عہدِ حاضر میں وہ دھڑکتا ہے
اس کا ویژن ہمیں بتاتا ہے
اس زمانے کا وہ نہیں شاعر
نابغہ بن کے ایسے آیا ہے
وہ جہانِ ادب پہ چھایا ہے
اس سا صدیوں میں کوئی آتا ہے
بن کے سورج جو جگمگاتا ہے
ہے جہانِ سخن میں اسکا وجود
ایک نعمت ادب میں اسکا ورود
آپ اپنی مثال ہے مسعود
معتبر اس سے ہے ادب منظر
وہ جہانِ ادب کا ہے امبر
وہ ہے اپنی مثال آپ جلیل
ہے ہنر اس کا عظمتوں کی دلیل...!

احمد جلیل

تمہید کا لاوا

یہ چولھا جل رہا ہے
اور ہنڈیا پک رہی ہے
تم اِس رحل کی رکھوالی پہ بیٹھی ہو
پرانی پا بریدہ بان کی پیڑھی میں دھنس کر
باڑھ میں پھنس کر کلائی کو گھماتی ہو
ذرا کفگیر کا چکر چلاتی ہو
تو یہ باورچی خانہ بھاپ کا مرغولہ بن جاتا ہے
اور تم جھولنے لگتی ہو مرغولوں کے جھولے
یہ چمنی نام کا حربہ
سرنگ ابھری ہوئی دیوار پر
جب چھت سے باہر سنسناتی ہے
تو اوپر اور اوپر آسماں تک ڈنک جاتا ہے
دھواں دھاروں کا جو اگلا دہانہ ہے
تمھیں پسلی میں پڑتا ہے
جہاں ماچس کی تیلی سرخ ہے
سرخی سکونت ہے
ذرا سا شوربا چکھ کر سمجھ لیتی ہو
اب کس آنچ کا، کیا کھیل ہے
کھانے میں کتنا وقت رہتا ہے
اِدھر میں اپنے کمرے میں
دبن ٹی وی کا کھولے
خبر کی اشتہا سے بے تکلف ہو رہا ہوں
پہاڑی منچ پر بیٹھے
شروع تار کے بازی گروں کا
دانہ پانی اٹھ چکا
اعلان ہوتا ہے
شروع کار کا آتش فشاں تھا، پھٹ گیا
گھر کی خبر رکھیے
میں کھلتا، کھولتا باورچی خانے میں پہنچتا ہوں
جہاں معمول کی بھاپ اٹھ رہی ہے
ہر طرف مرغولوں سے مرغولے جوڑے جا رہے ہیں
تم کہاں ہو؟

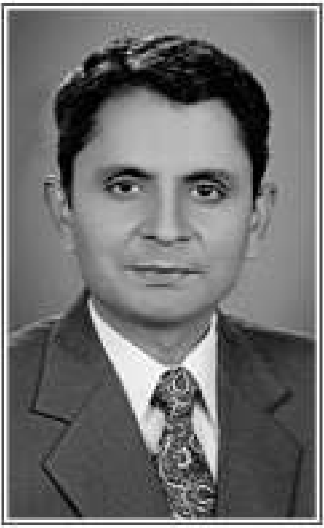

شاہین عباس

پاکستان......صرف بحران؟

......درد کی ٹیسیں ہیں کہ تھمتی نہیں
دل ربا سی بات بھی بھاتی نہیں
کیسی حالت ہے وطن کی دوستو
خیر کی کوئی خبر آتی نہیں!!

اس زمیں پہ ہر سیاست در بدر
اس ہنر میں کوئی بھی یکجا نہیں
تھا سیاست نام تو اسلوب کا
حکمرانوں کو طریقِ ہم نوا بھاتا نہیں

آگ ہے، گھیراؤ ہے، افراد ہیں املاک ہیں
چار جانب دشمنیں بے باک ہیں
ہے فقط کرسی حصولِ زندگی
آدمیت کو دھرے ہیں طاق پر

جرم کرنا ہر کسی کا فرض ہے
اف معیشت زیرے بھی سوگنا زیریں ہوئی
عام شہری کس قدر مقروض ہے

اے وطن، تو ارض ہے، ایمان ہے
کس قدر اسلاف کا پیمان ہے
تیرے دامن میں
------بھرا بحران ہے

فرخندہ شمیم

خاک سپردِ خاک

کن کی صدا گونجی
خاک و خاکستر سمیٹا گیا
یکساں پھر اسکو گوندا گیا
پتلے کی مانند سینچا گیا

مالکِ کل نے بنایا اسے
نین و نقش سے سجایا اسے
شیشے سا دل لگایا اسے
محبت کا پیکر بنایا اسے

کن کی صدا گونجی۔۔۔

پتلے میں روح پھونکی
خاک میں جان بھیجی
زندگی ادھار دے کر
زمین پہ اتارا گیا
مخلوق میں افضل بنایا گیا

اے خاک کے پتلے تری بساط کیا ہے؟
تُو مٹی ہے تری اوقات کیا ہے؟
ترے شب و روز، دن رات کیا ہے؟
منزل تری فقط خاک ہے
موت کو ہر پل تری تاک ہے
کن کی صدا گونجی

روح کھینچ لی گئی
زباں بھینچ لی گئی
آنکھ میچ لی گئی
سفید لباس میں لپیٹ کر
لحد میں سمٹ کر

خاک پھر سے سپردِ خاک ہوئی

فرح شاہد

ایک گُم نام محبت کی کہانی

کتنے
خود ساختہ خوف
بے سُود اندیشے
مرے جسم کی زمین پر اُگے
میں نے
وسوسوں کے حصار میں تمھیں
بے یقینی کے ساحل پر
لاحاصلی کی سمت سے گفتگو
کرتے دیکھا
کس قدر
خوف کی زنجیریں
میرے اِردگرد
مجھے جکڑے ہوئے
روزانہ تکلیف کے فلٹر سے گذارتی ہیں
فیصلہ کرنے کے لیے
حوصلہ نہیں
محض ایک لمحہ چاہیے
اور تُم
میری ذات کے لمحوں سے جڑی
ابدی محبت ہو
جسے عشروں
ڈر کا ذہنی اضطراب سہنا پڑا
اور مجھے
نارسائی کی جیل سے مفرور ہونا پڑا
وقت کا دیوتا
عمر کے اِس آخری حصے پر مہربان ہے
ہمیں اپنے مقدس فیصلے کو
کسی تصویر کے فریم میں چھپانا نہ پڑے
زندگی
اپنے تمام تر حُسن کے ساتھ جلوہ گر ہے
ہمیں آج کی شام
کسی فائیو سٹار ہوٹل میں گذارنی چاہیے
اور رات
ایک دوسرے کو تھپکتے ہوئے سو جانا چاہیے

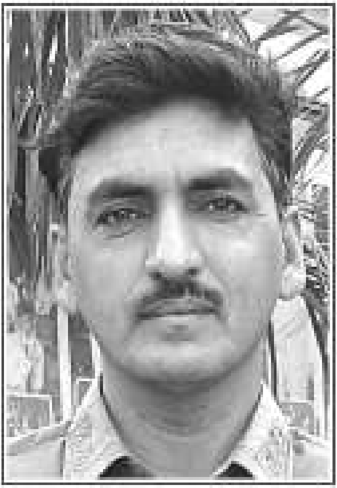

امجد بابر

نظم

مجھ سے پیار جتانے والے
رسم و راہ بڑھانے والے

مجھ میں کیا دیکھا ہے تُو نے
جس کے کارن تیرے من میں

ارمانوں کی جوت جگی ہے
آشاؤں کا دیپ جلا ہے

میں ہوں اک ویران سا منظر
جس میں کوئی رنگ نہیں ہے

میری ہستی ایک شرر ہے
تیرا روپ ہے شبنم جیسا

مجھ سے دُور رہے تو بہتر
تُو مسرور رہے تو بہتر

تجھ پہ کوئی آنچ نہ آئے
دامن تیرا جل نہ جائے

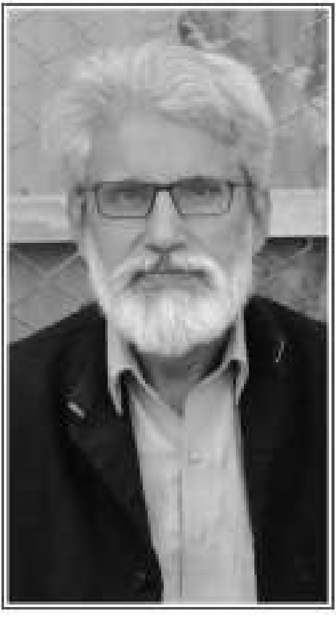

افضل ہزاروی

سوال

تُو بھی انساں
میں بھی انساں
تُو بھی میرے جیسا
میں بھی تیرے جیسا
تیرے پاس محل و ماڑی
میری کچی کٹیا ہے
تُو ہے "وڈیرہ"
میں ہوں "ہاری"
آخر تیرے میرے بیچ
یہ حدِ فاصل کیسی ہے
جب تُو بھی انساں
میں بھی انساں

نظم

بارشوں کے موسم میں جب بھی یاد آتے ہو
دل مرا دُکھاتے ہو
جب سے چھپ گئے ہو تم
چار سو اندھیرا ہے
روشنی، ہوا، بارش
سب یہ استعارے ہیں
ہر کسی کو پیارے ہیں
پر مجھے نہیں بھاتے
چین ہی نہیں آتا بے قراری رہتی ہے
اور مجھ سے کہتی ہے

اس کو ڈھونڈ لاؤ ناں
اس کو پھر مناؤ ناں
یار ہو یونہی گم سم
بارشیں تو آئیں گی
تم کو بس رلائیں گی
یاد سب دلائیں گی
دل کو بھی دُکھائیں گی
بارشوں کے موسم میں

ثقلین جعفری

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

میں کل کا آدمی ہُوں، مجھے کل پہ ٹال دے
اے دن! مجھے زوال کی حد سے نکال دے

زندوں کے جنازے

مَرے ہوؤں کے جنازوں پر تو سب آتے ہیں
پچھتاوے کا بوجھ اُٹھائے
رونے پیٹنے
اک دوجے کو پُرسہ دینے
اور کچھ شاید اوروں کو دکھانے
رشتوں پر احسان جتانے
کیونکہ دفنانے کے بعد
بٹوارہ بھی کرنا ہوتا ہے
بچے کھچے اسباب کا
اور اُن مخلص رشتوں کا
جنھیں مٹانا ہوتا ہے
منظر سے ہٹانا ہوتا ہے
ورنہ کون کسی کو روتا ہے

لیکن کچھ زندہ بھی مُردوں جیسے ہوتے ہیں
جنھیں زمانہ وقت سے پہلے سُولی پر لٹکا دیتا ہے
اپنی لاش اُٹھا کر وہ پھرتے رہتے ہیں
اپنے ہی کاندھوں پر
اپنا پرایا کوئی نہیں آتا
اُن کی لاش اُٹھانے
اُن کے جنازے کو کاندھا دینے
اور اُنھیں دفنانے
جیتے جی وہ مَر جاتے ہیں
لوگوں کے سفاک رویوں کے ہاتھوں
کوئی پُرسہ بھی اُنھیں دیتا نہیں ہے
اک قبرستان چھپائے پھرتے ہیں جو سینوں میں
خود کو دفنائے پھرتے ہیں جو سینوں میں

کاش! اذیت دینے والے بے حس لوگ
مَرے ہوؤں کا ماتم کرنے سے پہلے
زندوں کی بھی قدر کریں
اپنی جھوٹی انا کے خول سے باہر نکلیں
سچے رشتوں کو پہچانیں
اُن کے دل کا بوجھ بھی ہلکا کرنے بھی آ جائیں
زندہ لاشوں کو بھی دفنانے کا بندوبست کریں!
اُن کے آنسو دینے والے
اُن کے بھی آنسو پونچھیں
بھلے دکھاوا ہو اِس میں
اتنا تو احسان کریں
زندوں کو حیران کریں

ظہور چوہان

نثری نظم

لگتا ہے سب بھاگ رہے ہیں
کسی کو کسی کا ہوش نہیں
ہر کسی کو منزل پر پہنچنے کی جلدی ہے چاہے
شارٹ کٹ
اختیار کر کے چوٹی پہلے سر کرنے کی خواہش
راستوں میں مزید الجھا دے اب ہم
باتیں کرتے ستم
آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کرتے ہیں
کمزور لمحے کی گرفت
منزل کو کھوٹا نہ کر دے
سپیس ایج میں
جذبوں کی کوئی وقعت نہیں
دوسروں کی بابت سوچنا دانشمندی نہیں سمجھا جاتا
ہم وقت کی دوڑ میں جتنا آگے بڑھتے
جا رہے ہیں
دل اتنے خالی اور تنہا ہوتے جا رہے ہیں
پتا نہیں میں آخری بار پورے دل سے کب ہنسی تھی
آنکھیں اشکوں سے خالی ہیں
دل جذبوں سے
چلتے پھرتے سانس لیتے مشینی وجود ریس
میں جتے گھوڑے کی طرح صرف آگے کی
سمت دوڑنا جانتے ہیں
پیچھے کیا کچھ رہ گیا
کون دیکھے فرصت کسے ہے
وقت کے آسمان پر معلق زمانے
اپنے ہونے کا گیان مانگتے ہیں
اتنا سب کچھ پا کر بھی بھیتر خالی کیوں ہے
کامیابیاں وقتی خوشی دے کر اداسی کی
مہیب چادر اوڑھ لیتی ہیں
ان سب کے درمیاں کھو جانے والے
پل پھر لوٹ کر نہیں آتے
زندگی اندھی پارکنگ ہے
اس میں یوٹرن نہیں ہوتا

نائلہ راٹھور

کسانوں کی سعی اجرت میں ڈھلتی ہے [ملی نغمہ]

خالق آرزو

وطن کی سرزمیں سونا اُگلتی ہے
کسانوں کی سعی اجرت میں ڈھلتی ہے

ہمارا دیس ہے رشکِ چمن گویا
عطائے خاص ہیں سرو و سمن گویا

ذخائر کی بڑی بہتات ہے اس میں
یہاں پٹرول ہے ہر دھات ہے اس میں

نکالیں گے چھپے جو بھی خزانے ہیں
یہی خوشحال ہونے کے بہانے ہیں

میسر سرزمیں کو چار موسم ہیں
بصورت ایک موسم لاکھ عالم ہیں

مرے ہر خواب تعبیر ہے تجھ سے
مری عزت مری تشہیر ہے تجھ سے

زمیں پر دیس کو جنت بنائیں گے
یہی ہے آرزو تجھ کو سجائیں گے

بے خوفی

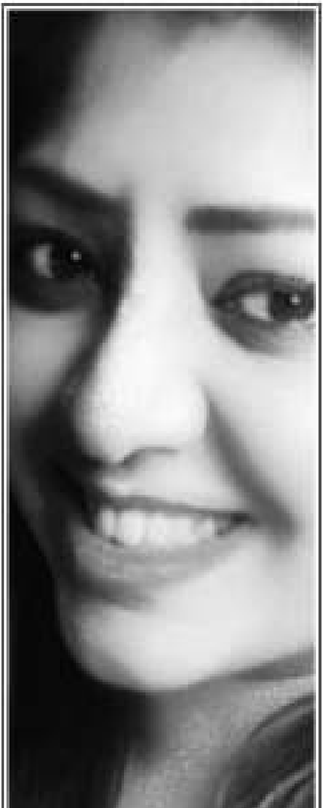

قسم اٹھاتی ہوں
اپنے جسم کے پور پور میں کھبے ہوئے ہر کانٹے کی
ایک ایک آبلۂ دل کی
آنکھوں سے بہے ہر آنسو کی
تیری قربت میرے لیے ہر درد کا درماں ہے
میرے "ہونے" کا معنی تیرا لمس کہلاتا ہے
قسم سے
میرا وجود خالی تھا
آنکھیں بے خواب تھیں
پھر بھی
خوف ہر جذبے پر بھاری ٹھہرتا ہے، ہمیشہ
مجھے میری زندگی کی قسم
تیرا فراق میرے ہر غم پہ بھاری ہے
تجھے میری قسم
مجھے اس خوف سے آزاد کردے......

فاطمہ عثمان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چڑیاں اڑ اڑ کر رہ جائیں
بابل کا گھر بھول نہ پائیں

غیر مکمل نظمیں

دفتر کے ہنگامے بھی کچھ کم تو نہیں ہیں
لیکن گھر کا سناٹا تو
جاں لیوا تھا
اندر باہر ہوتے سائے
تنہائی کے مارے
گھر کی دیواروں میں دفن خرابے
بولتے ہیں

خوابوں کی جو قیمت
آپ چکا بیٹھے ہیں
راشد صاحب! آپ اداکاری میں کتنے یکتا تھے
لیکن سالا مانکا شاید۔۔۔!
آپ سے تھوڑا آگے تھی

بات بہت لمبی ہے لیکن
میں اس دفتر میں نوکر ہوں
میری ذمہ داریاں۔۔۔۔۔
میری ساری نظمیں۔۔۔۔
اب تک غیر مکمل ہیں

نوید صادق

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دُکھ کی سج دھج، تج کے اُٹھ، خالد! صفِ ماتم سمیٹ
دل کی گلیاں چھان، شریانیں کھنگال اُس کے لیے

ابھی نہ مجھ سے تقاضا کرنا

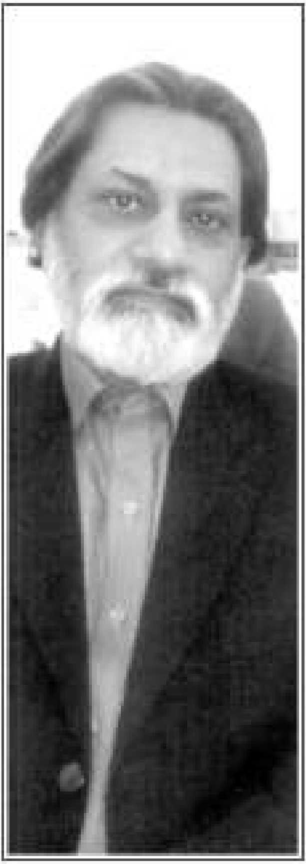

بہت سے دُکھ ہیں

انھیں دُکھوں میں تمھارا دُکھ بھی چھپا ہوا ہے

میں روز و شب کی مشقتوں سے تھکا ہوا ہوں

کوئی محبت کوئی سہارا

کسی کا دُکھ بھی

ابھی میں واپس نہ کر سکوں گا

ابھی نہ مجھ سے تقاضا کرنا

میں روز و شب کی مشقتوں سے تھکا ہوا ہوں

اعجاز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کم نظر روتے رہے ہم نظروں کا رونا
دیکھتا کون ترے دیدہ وروں کا رونا

جناب رحمان فارس، جناب شکیل جاذب، جناب باصر سلطان کاظمی، جناب عباس تابش،
جناب سلیم ساگر، جناب عمران منظور، جناب حماد نیازی

جناب مرزا حامد بیگ، جناب حامد یزدانی جناب خالد احمد، جناب زاہد مسعود

جناب حامد یزدانی، جناب تسلیم الٰہی زلفی، جناب عمران منظور

عمران منظور مہمانانِ گرام کو پھول پیش کرتے ہوئے۔

نعمان منظور تقریب میں استقبالیہ تقریر کرتے ہوئے

عمران منظور، جناب حماد نیازی اور جناب ڈاکٹر غافر شہزاد